کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

1891 to 1971
Rev. Allama Barakat Ullah
M.A.F.R.A.S

Are All World Religions The Same?

By
The Late Allama Barakat Ullah (M.A)
Fellow of the Royal Asiatic Society London

مصنفہ
علامہ برکت اللہ صاحب ایم۔اے۔ایم۔آر۔اے۔ایس

مصنف
محمد عربی ،کلمتہ اللہ کی تعلیم ،نور الہدیٰ ،توضیح البیان فی اصول القرآن
دین فطرت اسلام یا مسیحیت؟ اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی؟ صحتِ کتب مقدسہ،
مسیحیت کی عالمگیری، دشتِ کربلا یا کوہ کلوری؟ مسیحیت اور سائنس ،صلیب کے علمبردار

کرسچن نالج سوسائٹی ۔لاہور
۱۹۴۱ء
www.muhammadanism.org
Urdu
May 17, 2007

دیباچہ

جب سیدنا مسیح اپنی زندگی کے آخری ہفتہ میں یروشلیم گئے تو آپ نے پروردگار کے بیت اللہ میں داخل ہوکر اُن سب کو نکال دیا جنہوں نے اُس عبادت گاہ کو ڈاکوؤں کی کھوہ بنا رکھا تھا۔ اس پر اہلِ یہود کے امام اعظم اوریہودی قوم کے بزرگ غضبناک ہوکر سیدنا مسیح کے پاس آئے اوراُنہوں نے آپ سے پوچھا:

" تو ان کاموں کو کس اختیار سے کرتا ہے؟ اورکس نے تجھے یہ اختیاردیا ہے" (متی ۲۱: ۲۳)۔

دورِ حاضر میں مسیحیت کی طفیل ہندوستان میں سے ہرقسم کی بدروحیں نکل رہی ہیں ۔ جہالت کی ناپاک روح نے دم توڑدیا ہے۔ وہ لوگ جوارواح بد کی خوف ودہشت کی زنجیروں میں مقید ہوکر ہر وقت ترساں اور لرزاں رہتے تھے اورتعویذ اورگنڈے تلاش کرتے پھرتے تھے مسیحیت کی بدولت بے باک ہوکر آزاد پھر رہے ہیں۔اُچھوت کی بدورح چیخ کرپکارتی اور کہتی ہے :

" اے خدا کے بیٹے ہمیں تجھ سے کیا کام؟ میں تیری منت کرتی ہوں مجھے عذاب میں نہ ڈال" (لوقا ۸: ۲۸)۔

کلمتہ اللہ کی زبانِ معجز بیان نے دیوداستی، حرامکاری اورشہوت باہمی پرخاش اورعداوت ، جبر تحکم اوروحشت وغیرہ بیماریوں کوایکل کلمہ سے دورکردیا اور ہندوستان کو جنت نشا ن بنادیا۔

لیکن ہندوستان کے غیرمسیحی مذہبی پیشوا اورقومِ ہند کے لیڈروں کو یہ خدشہ پیداہوگیا ہے کہ مسیحیت کی اشاعت سے اُن کی تعداد رسُوخ ، اقتدار اوروقارِمیں فرق آجا ئیگااوراُن کی اقتصادی اورسیاسی طاقت کو ضعف پہنچیگا پس وہ سیدنا مسیح کےنام لیواؤں کو ڈانٹ کرپوچھتے ہیں "تم ان کاموں کو کس اختیار سے کرتے ہو"کس نے تم کو یہ اختیاردیا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کرو؟ ہم یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ تم ہمارے لوگوں کو اُن کے مذہب اورملت سے نکال کر مسیحی کلیسیا میں داخل کرو،اگرتم اپنی عمر اورمال وزراُن کو دنیاوی تعلیم دینے اورنیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرنے میں صرف کرنا چاہتے ہوتوہم کواعتراض نہیں لیکن ہم اس بات کی ہرگز اجازت نہ دینگے کہ وہ اپنے مذاہب کوتبدیل کرکے مسیحی ہوجائیں اور صرف مسیح کوواحد منجئی مانیں۔ان کا موجودہ مذہب بھی اچھا ہے اُن کے اوتار اورگرو بھی

سیدنا مسیح کی طرح قابلِ تعظیم ہستیاں ہیں تم کوکوئی حق حاصل نہیں کہ تم سیدنا مسیح کو واحد اوراکیلا نجات دہندہ مانو اورمنواؤ اوراُس کو دوسرے گوروں اورنبیوں اوراوتاروں پر فضیلت دے کراُن کوادنیٰ اوراُس کوایک اعلیٰ اوربرترہستی مانو۔ تمام مذاہب یکساں طورپر صحیح اوردرست ہیں اورتمام مذاہب کے بانی یکساں طورپر واجب التعظیم ہیں۔

مسیحی کلیسیا کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے اپنے رسالہ نورالہدٰی میں ذکر کیا تھاکہ قرون اولیٰ میں رومی سلطنت کے قیاصرہ نے بہتیرا زورمارا کہ مسیحیت دیگرمذاہب کے ساتھ میل جول اورمصالحت پیدا کرلےلیکن بالفاظِ مورخ لیکی" مسیحیت نے آتے ہی یہ صاف صاف کہہ دیاکہ اس کے سوا دنیا کے تمام مذاہب باطل ہیں اورنجات صرف اس کی پیروؤں کے لئے ہے"(تاریخ اخلاق یورپ جلد اول صفحہ ۳۲۹) اس عقیدہ کی وجہ سے مسیحیوں کوسربکف ہونا پڑا اورسلطنتِ روم کی سرزمین تین سوسال تک ان کے خون سے متواتر لال ہوتی رہی لیکن اُنہوں نے قیصر کے حکم کے آگے سرنہ جھکایا۔ روم، یونان ومصر کے دیوتاؤں اورسیدنا مسیح کی شخصیت کوایک ہی سطح پر نہ رکھا۔ بلکہ وہ ببانگ دہل یہ اعلان کرتے رہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اُن کو شرمناک جھوٹ پر مجبورنہ کرسکے گی کہ تمام مذہب اپنی اپنی جگہ یکساں طورپر صحیح ہیں اور تمام ہادی یکساں طورپر واجب التعظیم اورقابلِ تقلید ہیں۔ مسیحی کلیسیا کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جہاں جہاں مسیحیت گئی ہر ملک وزمانہ میں اُس نے اعلیٰ الاعلان یہ کہاکہ کلمتہ اللہ کی تعلیم بلند ترین ہے اورمسیحیت ہرمذہب پر غالب ہے۔سیدنا مسیح دنیا کے واحد اور اکیلا نجات دہندہ ہے جس کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کی تمام واجب التعظیم ہستیاں ایسی ہیں جیسی آفتابِ عالم تاب کے سامنے آسمان کے ستارے اوراس صداقت پر مسیحی مبلغین اورکلیسیا کے بے شمارافراد نے لاکھوں بلکہ کروڑوں دفعہ اپنے خون سے مہُرلگائی۔

ہندوستان کے مذہبی پیشوا اورسیاسی لیڈرمختلف طریقوں سے وہی کوشش کررہے ہیں جواب تک بے سود اورناکام ثابت ہوئی ہے۔ وہ ہرممکن طورپراس بات کا پراپاغنڈاکررہے ہیں کہ ہندوستان میں مسیحیت اوردیگر مذاہب کویکساں تسلیم کرلیا جائے۔ کبھی وہ اس بات کوایک سودیشی اورقومی ضرورت بتلاکر اُن ہندوستانی مسیحیوں کومتاثر کرنا چاہتے ہیں جوسودیشی وطن اور قومیت کے

شیدائی ہیں۔ کبھی وہ اس بات کوایک بدیہی حقیقت بتلاتے ہیں جوایسی صریح ہے کہ اُس کے واضح کرنے کی بھی ضرورت نہیں اور یوں جہلا کے طبقہ کواپنے دام میں پھنساتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس بات کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اوریوں اپنا لو سیدھا کرتے ہیں ۔ غرضیکہ ہرطرح سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس گمراہ کن بات کوپھیلایا جائے کہ تمام مذاہب برابرہیں۔ اوران میں کوئی تفریق وتمیز نہیں پس ایک مذہب کو بدل کر دوسرے کو اختیارکرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

انشاء اللہ اس رسالہ میں ہم ان مختلف پہلوؤں پر بحث کرینگے۔ ہم غیر مسیحی لیڈروں کے مختلف دعاوی کی تنقیع کرکے اُن پر تنقیدی نگاہ ڈالیں گے تاکہ معلوم ہوسکے کہ ازروئے عقل ان میں صداقت ہے یا نہیں۔ ہم مسیحیت کے اُصول اورادعائے مسیح کی روشنی میں ان کے دعاوی کو جانچیں گے تاکہ یہ معلوم کریں کہ ہم انجیل جلیل کی تعلیم کو مان کراورسیدنا مسیح کے حلقہ بگوش ہوکر ان لیڈروں کی تعلیم کوتسلیم کرسکتے یا نہیں۔

دورِحاضرہ کے ہندوؤں پرانجیل جلیل کی تعلیم کا اثراس قدر ہواہے کہ وہ اب مورتی پوجا کوترک کرکے بیٹھے ہیں اورہندورسوم ورواج کے قبیح اوراخلاق سوزپہلوؤں سے گریز کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اُن تمام باتوں کو خیرباد کہہ دیا ہے جواس دھرم میں کم مایہ اورادنیٰ اورہیچ تھیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو فرماتے ہیں کہ " ہمارا مذہب قصابوں کا مذہب ہے۔ ہم اسی بات میں ہلکان رہتے ہیں کہ کس شے کو چھوئیں اورکس شئے کو نہ چھوئیں۔ اشنان کرنے ، چُٹیارکھنے ، ماتھے پرٹیکا لگانے کی رسوم وغیرہ اب بے معنی باتیں رہ گئی ہیں۔ ہمارے دیوتا انگلستان اورجاپان کے کارخانوں میں بنائے جاتے ہیں اوریہاں ہندوستان میں ہماری پوجا کیلئے اُن کی درآمد ہوتی ہے[1]۔ لیکن

نونہ گردوکعبہ رارخت حیات

گرازفرنگ آیدش لات ومنات

کلمتہ اللہ کی تعلیم اوراُصول کی روشنی میں ہندوؤں کے مختلف فرقے اپنے عقائد ورسوم کی دھڑا دھڑاصلاح کررہے ہیں۔ اب سے سوسال پہلے کے ہندوجب مسیحیت کی روشنی میں اپنے مذہب کو دیکھتے تھے تووہ ان کوایک نفرت انگیز اورگھنونی شے معلوم ہوتی تھی کیونکہ مسیحیت کے نورکے مقابلہ میں وہ ایک تاریک شے تھی۔

---

[1] New Era, Oct.1928 p.28

لیکن دورِ حاضرہ کے ہندوخیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کے عقائد اوررسوم کی اصلاح کرکے ہندومت کے حلقہ میں رہ سکتے ہیں اورچونکہ ہندو حلقہ کے اندران کے عقائد کی نسبت اُن سے کسی قسم کی بازپُرس نہیں کی جاتی اوروہ اس کے دائرہ کے اندر رہ کر جوچاہیں مان سکتے ہیں لہذا وہ مسیحیت کے حلقہ بگوش ہونا نہیں چاہتے۔ چونکہ یہ ایک اتفاق ہے کہ مسیحیت کے پرچارک انگلستان سے آئے تھے جوہندوستان پر حکمران تھا لہذا مسیحیت کے دشمن مسیحیت کوایک بدیشی مذہب کہہ کر قوم پرست ہندوؤں کو اس کے خلاف اُکساتے ہیں۔ ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوگیاہے کہ اصلاح شدہ ہندومت مسیحیت کا جانی دشمن ہوگیا ہے۔

کس نیا موخت علم تیرازمن

کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرو

چنانچہ پروفیسر رادھاکرشن صاحب ہندومت اورمسیحیت کے تعلقات کی اس سیاسی رشتہ کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جواب تک ہندوستان اورانگلستان میں رہاہے۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ انگریزی راج کاپہلا زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج کا زمانہ تھا جب انگریز ہندوستانیوں کوبنظرِ حقارت دیکھتے تھے چنانچہ اُس زمانہ میں ہندومت کوہیچ سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا زمانہ امپرئیل ازم یا شہنشائیت کا زمانہ تھا جب انگریزی راج کی وجہ سے ہندوستانی انگریزوں کے ماتحت تھے اورانگریز اُن کے سرتاج تھے چنانچہ اس زمانہ میں ہندومت کومسیحیت کے ماتحت سمجھا جاتا تھا اورمسیحی مذہب ہندومت کوکامل کرنے والا درخشاں تاج خیال کیا جاتا تھا۔ تیسرا زمانہ دورحاضرہ کا ہے جب ہندوستان کو برطانیہ کی اقوام کے خاندان کا ایک ممبر اوردونوں کوبرابر سمجھا جاتا ہے۔ پس اب وقت آگیاہے کہ مسیحیت اورہندومت دوش بدوش ہوکر ایک خاندان کے ممبروں کی طرح برابر قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔ جس طرح ہندواس بات کے لئے تیارہیں کہ مسیح کو ایک عظیم ترین اخلاقی اُستاد مان لیں اوررام یا کرشن یاشو کی طرح اُس کی بھی پوجا کریں اسی طرح لازم ہے کہ مسیحی بھی ہندوؤں کی کتابوں کوبائبل کی طرح الہامی اوربرحق مان لیں اوران کے دیوی دیوتاؤں کی اپنے مسیح کی طرح قدراوروقعت کریں۔

لیکن انجیل جلیل کو ماننے والے اورسیدنا مسیح پر ایمان رکھنے والے ہرگز اس بات کے لئے تیار نہیں ہوسکتے۔ اس قسم کی مذہبی رواداری کلمتہ اللہ کے نزدیک اورآپ کے رسولوں کے نزدیک

غلط ہے اورمسیحی کلیسیا کے نزدیک یہ رویہ مسیح سے غداری کا رویہ ہے اوراس کے انکارکرنے کے برابر ہونے کی وجہ سے ایک ناقابل معافی گناہ ہے ۔ سیدنا مسیح کی اورآپ کے مبلغین کی یہ تعلیم نہ تھی کہ آپ دنیا کے دیگر معلموں کی طرح ایک معلم ہیں بلکہ انجیل جلیل کی تعلیم کا تمام زوراس بات پر ہے کہ کلمتہ اللہ کا مکاشفہ کامل اور اکمل ہے۔ منجئی عالمین کی نجات کامل کافی اوروافی ہے اور مسیحیت کی طاقت اسی میں ہمیشہ مضمر رہی ۔ جوسبق ہمارے ہندوبھائی ہندوستانی کلیسیا کو پڑھاناچاہتے ہیں اگروہ درست اورصحیح ہوتا توقرون اولیٰ میں جیساکہ اپنے رسالہ نورالہدیٰ میں ذکر کرچکے ہیں ۔ مسیحیت بھی دیگرادیان باطلہ میں سے ایک ہوجاتی اورشہادت کی نوبت نہ آتی۔ بُت پرست قیاصرہ روم مسیحیت کو تباہ کرنے پر صرف اسی وجہ سے تُلے تھے کہ کلیسیا مسیح کو وہ درجہ نہیں دیتی تھی جوبُت پرست مذاہب میں دیوی دیوتاؤں کا درجہ تھا۔ اُس میں عصبیت تھی اوریہ عصبیت مسیحیت کی زندگی کا باعث تھی اوراگروہ اپنے اصول پر قائم نہ رہتی تووہ کب کی دیگرادیان اوربُت پرست مذاہب میں جذب ہوگئی ہوتی۔ اورآج کے روزاُن مذاہب باطلہ کی طرح اس کا بھی صفحہ ہستی سے نام ونشان مٹ گیا ہوتا۔ اسی طرح اگرہندوستانی کلیسیا بُت پرست ہندوؤں کی آوزسن کر اپنے آقا ومولا اورانجیل سے غداری کرکے ان کے اصول پر قائم نہ رہیگی تواس میں رتی بھرشک نہیں کہ وہ ہندومذہب میں جذب ہوجائیگی اورہندوستان سے اس کا نام ونشان مٹ جائیگا۔ لیکن اگرکلیسیا اپنے اصول پر قائم رہی اور" اپنے ایمان کو تھامے رہی" توجس طرح آج کوئی شخص اوسیرس اورآئی سس ، ڈیمٹر اورپرسی فونی، ایڈنس اوراطیس ، ڈایونیسیس اورجوپیٹر اوردیگر مذاہبِ کفر کے دیوی دیوتاؤں کے نام نہیں جانتا کیونکہ مسیح ان سب پر فاتح رہا اسی طرح نزدیک کے مستقبل میں ہندومذہب کے دیوی دیوتاؤں سے لوگ ناواقف ہوجائیں گے اورسیدنا مسیح سب پر فاتح رہے گا۔کیونکہ حق اورباطل کی لڑائی میں حق بالاآخرت سب پر غالب رہتا ہے سیدنا مسیح جوراہ حق اورزندگی ہے سب پر غالب ہوکر رہے گا۔

یہ رسالہ مختلف قسم کی مصروفیتوں کے دوران میں لکھا گیا ہے۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ میں اس کے بعض حصص کے مضامین کواس طرح ادا نہیں کرسکا جس طرح ان کا حق تھا۔ اس رسالہ کے بعض دلائل کو یں مفصل طورپر لکھنا چاہتا تھا لیکن عدیم

الفرصتی نے یہ نہ ہونے دیا۔ پس بایں خیال کہ عاقل را اشارہ کافی است ان کو اسی حالت میں رہنے دیا۔ اگرمختلف ابواب میں بعض نکات دہرائے گئے ہیں ۔ تو بمصداق

لذیذ بُود حکایت درازتر گفتم

یہ مسورہ دوسال سے میرے پاس پڑا ہوا ہے۔ میرا خیال تھاکہ موقعہ پاکر اس کی نظر ثانی کرکے اس کی خامیوں کورفع کرسکوں گالیکن فرصت نہیں ملی پس مجبورہوکر اس رسالہ کو اس کی موجودہ صورت میں پریس میں بھیج رہا ہوں ۔

میری دعا ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ ہمارے ہم وطن راستی اورصداقت کو پہنچایں اورسیدنا مسیح پر ایمان لائیں تاکہ ہمارے ملک اورقوم کی دنیاوی فلاح اورروحانی ترہو۔

پتولی ۔ ضلع لاہور

۲۸ فروری ۱۹۴۱ء

برکت اللہ

بابِ اوّل

ہنُدودھَرم اورمذھبی رواداری

ہنُدومت کی تعریف

ہنُدودھرم اُن معنوں میں "مذہب" نہیں جن میں معنوں میں اسلام یا مسیحیت یا مذاہب ہیں " دھرم " کا لفظ" مذہب" کا مترادف نہیں بلکہ اس کا مطلب "طبعی معمول" یا" دستورالعمل" ہے۔ مثلاً آگ کا دھرم جلانا ہے۔ کشتری کا دھرم لڑنا ہے۔ لیکن اسلام یا مسیحیت کے نقطہ نگاہ سے " مذہب" اس رشتہ کا نام ہے جوخدا اورانسان کے درمیان ہےاوراس رشتہ کے امتیازی نشان کی وجہ سے اسلام اورمسیحیت کے چند مخصوص عقائد ہیں جن کو اسلامی یا مسیحی عقائد کہا جاتا ہے۔لیکن چونکہ ہنُدودھرم خدا اورانسان کے درمیانی رشتہ کا نام نہیں لہذا ہندودھرم کی کوئی مخصوص عقائد بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندودھرم میں ہر قسم کے مختلف متنفر اور متضاد خیالات موجود ہیں۔ مثلاً اس کے حلقہ کے اندراگرایک فرقہ ویدوں کو مانتا ہے دُوسرا اُن کو نہیں مانتا۔ایک اُپنشدوں کو مانتا ہے تودوسرا نہیں مانتا۔ اگرایک فرقہ خدا کی وحت کا

قائل ہے تودوسرا کروڑوں دیوتاؤں کو مانتا ہے۔ تیسرا خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ اگر قائلینِ روح ہندو ہیں تومنکرین روح بھی ہندو ہیں۔ مجسم حلو ا تحاد اوراوتار کے ماننے والے ہندو ہیں تونرگن ایشور کوماننے والے بھی ہندو ہیں۔ واحد الوجود کے ماننے والے بھی ہیں ہندو ہیں اورخدا کے علاوہ روح اورمادہ کوبھی ازلی ماننے والے بھی ہندو اگرایک گٔور کھشا کا قائل ہے تودوسرا گائے کاگوشت کھاتا ہے۔اگرایک فرقہ ویدانت خیالات کی پیروی کرتا ہے تودُوسرا مادیت کا قائل ہے اگرایک شِو کی پُوجا کرتا ہے تودوسرا کرشن کی پرستش کرتا ہے۔ ایک وشنو کےآگے ماتھا ٹیکتا ہے تودوسرا کالی کے آگے سربسجود ہے۔ ان دیوتاؤں اورمعبودوں کی صفات میں اس قدر اختلاف ہے کہ خدا کی پناہ۔لیکن یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ہرشخص خدا ہی کی پُوجاکرتا ہے چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں کہ:

" وہ جو ادھ دیوؤں کی پوجا کرتے ہیں وہ بھی میری ہی پوُجا کرتے ہیں"(۹: ۲۳)

لیکن اگربعض دیوتاؤں کی صفات کونیک سمجھ کر ان کی پیروی کی جائے توانسان بدترین خالق بن جائے۔ غرضیکہ ہندودھرم ایک کجکول ہے جس میں ہر طرح کے متفرق خیالات اورہرقسم کے متضاد عقائد پہلو بہ پہلو رواداری اورمصالحت کے ساتھ ہزاروں برسوں سے رہتے چلے آئے ہیں ۔ اگران میں کوئی مشترکہ شے ہے تووہ کرم کا اُصول اورتناسخ کا مسئلہ ہے۔ ان دونو ں عقیدوں کی تعلیم اپُنشدوں میں دی گئی ہے اورمابعد کا تمام ہندو فلسفہ ان دوباتوں کوصحیح اورراست مان کر ان کو اپنے مفروضات میں داخل کرلیتا ہے۔

چونکہ ہندومت کے کوئی مخصوص عقائد نہیں ہیں لہذا ہرشخص اس مت کی منقطی تعریف کرنے سے قاصر ہے۔بعض وضلاء کے نزدیک ہندومت کی خصوصیت ذات پات کی پابندی ہے۔ مسٹرگاندھی نے ایک مشنری سے دورانِ ملاقات میں کہا" میرے نردیک لفظ" ہندوازم" لفظ" مذہب " کا مترادف ہے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ فضلا کے نزدیک ہندوازم کی خصوصیت ذات پات کی تمیز ہے جس امتیاز کے آپ قائل نہیں۔ توآپ نے فرمایاکہ یہ تمیز ہندومت کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہندوازم کی خصوصیت آہمسہ کی تعلیم ہے۔ مشنری نے کہاکہ اگرآپ کا قول درست ہے توبدھ مت اورجین مت اورہندومت میں کیا فرق ہے۔ کیونکہ بدھ

مت نے آہمسہ کی تعلیم ہندوستان کے باہر غیر ممالک مثلاً چین وجاپان میں پھیلائی ہے؟ (فیلو شپ بابت متی ۱۹۳۴ء)۔

مسٹر گاندھی اہمسہ کو ہندومت کی خصوصی تعلیم سمجھتے ہیں لیکن سر سوامی آئر جیسا زبردست عالم اس نظریہ کی تردید کرتا ہے (ہندوستان ریویو بابت جنوری ۱۹۴۱ء) بھاگوت گیتا میں یہ تعلیم نہیں ملتی۔ بلکہ اس میں کرشن جی ارجن کو جنگ پر آمادہ کرتے ہیں۔ بفرض محال ہم تسلیم کرلیں کہ آہمسہ ہندومت کی خصوصی تعلیم ہے تو جیسا اُوپر ذکر ہوا ہے اس مت کو ہم بُدھ مت اورجین مت سے کس طرح امتیاز کرسکتے ہیں کیونکہ ان موخرالذکر مذہبوں کی بھی یہی خصوصی تعلیم ہے؟ ہندومہاسبھا کا پریذیڈنٹ ڈاکٹر ساورکا کہتا ہے کہ:

"ہندووہ ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہے اوراس ملک کے کسی مذہب کا پیر وہے" (ٹریبون لاہور ۲۷ مارچ ۱۹۴۰ء)۔

لیکن اس قسم کی تعریف اُن تمام امریکن انگریز اوردیگر غیرہندی اشخاص کو ہندومت کے حلقہ سے خارج کردیتی ہے جو شُدھی کے ذریعہ اس میں داخل کئے گئے ہیں۔ بلکہ یہ تعریف خاص ہندومت کے پیروؤں اورہندوستان کے دیگر مذاہب کے پیروؤں میں تمیز نہیں کرتی"۔ بعض کہتے ہیں کہ ہندو وہ ہے جو چار ذاتوں میں سے کسی ذات کے اندر پیدا ہوا ہو۔ لیکن موجودہ زمانے کے ہندو ذات پات کی تمیز کو مٹانے کے درپے ہورہے ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ ہندو وہ ہے جو اپنے آپ کو ہندو کہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُصولِ منطق کے مطابق لفظ " ہندو" کی تعریف ایک امر محال ہے ۔

ہندو مت کا دائرہ گویا ایک چڑیا خانہ کی طرح ہے جہاں ہرقسم کے جاندار ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوتے ہیں جمع کئے جاتے ہیں اور ہندومت کے حلقہ بگوش متناقض اورمتضاد خیالات کو جو ہندومت کے اندر جمع ہیں مانتے ہیں۔ جس طرح چڑیا گھر میں شیر بکری کا اور عقاب چڑیا کا نقصانِ جان نہیں کرسکتا اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ متضاد خیالات ایک دوسرے کے ساتھ شیروشکر ہوکر رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک کے مایہ ناز فلاسفر رادھا کرشن جو ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں کہتے ہیں کہ:

"ہندو مذہب خدا کے مختلف تصورات میں سے کسی ای تصور کو حق یاباطل قرار نہیں دیتا اورنہ کسی ایک تصور کو کُل بنی نوع انسان کے لئے قطعی معیار تسلیم کرتاہے۔ ہرشخص کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جو تصور اورطریقہ عبادت اس کو پسند آئے وہ اسی کو اختیار کرے[2]۔

---

2 Hindu View of Life,pp.31,32,46

بقول شخصے

درحیرتم کودشمنی کفرودین زچیست
ازیک چراغ کعبہ بُت خانہ روشن است

ہندومت اورعبات کی علتِ غائی

پس ہندودھرم میں درحقیقت کوئی عقائد نہیں جوہندومت کے ساتھ مخصوص ہوں چنانچہ ہندومت کواس بات پرنازبھی ہے کہ وہ کسی خاص عقیدہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہے ایک مصنف نے اس مت کا نام رکھاہے Nameless of a Hundred Names یعنی جس کے سونام ہے اورپھربھی نام نہیں رکھتا"۔پس اس کا دائرہ محدود نہیں ہرشخص اس کے حلقہ میں رہ کرجوچاہے مان سکتاہے کوئی اس سے تعرض نہیں کرسکتا۔ ہندومت کا تعلق نہ توکسی عقیدہ کے ساتھ ہے اورنہ اس کے دھرم کی بنیاد کسی ایک تواریخی شخص پر قائم ہے۔ چنانچہ سوامی دیویکانند کہتاہے کہ تمام مذاہب میں ہندومذہب ہی ایک ایسا مذہب ہے" جس کا جہازتاریخ کی چٹان سے ٹکراکرپاش پاش نہیں ہوتا" چونکہ تاریخ اورزمان ومکان کے تعلقات محض مایا ہیں لہذا خدا کا کامل مکاشفہ زمان ومکان کی حدود کے اندرنہیں ہوسکتا۔ پس ہندو کہتے ہیں کہ اس بات کا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارے اوتارتواریخی شخص تھے یا نہ تھے اوران کے قصص تاریخ اورحقیقت پرمبنی ہیں یا محض افسانے اورانسانی تخیل کا نتیجہ ہیں۔مذہب کا کام عبادت گذاروں کے جذبات کو مشتعل کرنا ہے خواہ کسی وسیلے سے کئے جائیں۔

ہم کو تودل لگی سے غرض ہے کہیں سہی
گرتو نہیں تواورکوئی منہ جبیں سہی

اگرہم اپنے جذبات کوکالی یاکرشن یاوشنو یا مسیح کی پرستش سے بھڑکاسکتے ہیں تویہ بس ہے۔ ہم پریہ لازم نہیں کہ عقل کے ذریعہ کالی کی صفات یاکرشن کے کارناموں کی تنقیح وتنقید کریں یا دریافت کرتے پھریں کہ کرشن یا رام یا محمد یا مسیح کوئی تواریخی شخص تھے یا نہیں۔چنانچہ سوامی دیویکا نند اقرارکرتے ہیں کہ کرشن کوئی تواریخی شخص نہیں تھا۔ لیکن اس پربھی وہ کرشن کوکامل ترین اوتارمانتے ہیں اوران دوباتوں کے ماننے میں ان کوکوئی ناموافقت نظرنہیں آتی۔

علیٰ ہذا القیاس مسٹر گاندھی مسیحی گیتوں میں سے زیل کا گیت سب سے زیادہ گاتے ہیں:

صلیب پر جب میں کرتا دھیان
جس پر ہے مُوارب النور
تونفخ گنتاہوں نقصان
حقیر میں جانتاہوں سب غرور

نہ ہو کہ مجھے فخر ہو

مگر صلیب پر یسوع کی

دنیا کی شان وشوکت کو

چھوڑدوں گا خاطر یسوع کی

دیکھ اس کے پانچوں زخموں سے

ہے جاری غم اورپیار کی دھار

کیا کبھی دیکھا کانٹوں سے

تاج بنا ایسا رونق وار؟

گر نذر کُروں کل جہان

توتیرے لائق نہیں ہے

توچاہتامیرا دل اورجان

سوسدا تیرے پیار کی جے

مسیح کے دکھ اٹھانے سے

بچ گئے سارے آدم زاد

اب اُسکے خون خریدوں سے

ہواُس کی حمد ابدآلاباد

لیکن اس قسم کے گیت کے بعد ہی آپ ہندودیوتاؤں کے گیت گاتے ہیں اوردونوں قسم کے گیتوں میں بنیادی اختلاف مغائرت اور ناموافقت یاغیر مطابقت نہیں دیکھتے۔ ہندوؤں کے نزدیک خدا ایک ایسی ہستی ہے جوصفات سے معرا اوربالا ہے لہذا اُن کو یہ پروانہیں ہوتی کہ جس شے اُس کو تشبیہ دیتے ہیں وہ مناسب ہے یا غیر موزوں ہے ۔ چونکہ پرماتما کی ذات کو وہ جان نہیں سکتے لہذا اُن کے لئے یکساں ہے خواہ اس کو مسیح یاکرشن یاشو یارام یاکالی کہا جائے ۔ تمام مذاہب جذبات کومشتعل کرنے میں ممدومعاون ہیں لہذا تمام مذاہب یکساں طوپر برحق ہیں۔

لیکن عقل سلیم تویہ تقاضاکرکے پوچھتی ہیں کہ آخر یہ دیوتا جن کی ہندو پرستش کرتے ہیں کیا ہیں اورکون ہیں ان کی ذات اورصفات حقیقت کے معیارپرپوری اُترتی ہیں یا کہ نہیں؟

۲

ہمارے ہندوبرادران کے خیال کے مطابق مذہب غائیت عابد کے جذبہ کو بھڑکانا ہے خواہ وہ ایک حقیقی تواریخی ہستی کے ذریعہ جواس دنیا میں ہماری طرح کا انسان تھا بھڑکایا جائے خواہ ہم انسانی تخیل اورفسانوں سے کام لے کر اس مقصد کو پورا کریں۔ لیکن ہم اپنی روحانی زندگی کومحض خیالی وجود قصے داستان یا محض افسانہ پر قائم نہیں کرسکتے۔ اگرہمارے ایمان کی جوخدا پر ہے بنیاد صرف انسانی تخیل پر ہے توظاہر ہے کہ ایک نامعلوم غیر تواریخی شخص سے خیالی محبت ایک نہایت نامعقول بنیاد ہے جس پر ایمان کی محکم عمارت ہرگز قائم نہیں ہوسکتی ۔ کوئی شخص کسی نامعلوم ہستی رکھنے والی عورت سے مجنونانہ خیالی محبت رکھ کر

اپنے گھر اولاد خاندان کی بنیاد قائم نہیں کرسکتا۔ ایسے شخص پر تمام دنیا ہنسے گی لیکن ہم حیران ہیں کہ روحانی اُمور میں سلیم الطبع اشخصا اس قسم کی مضحکہ خیزباتیں کس طرح تسلیم کرلیتے ہیں؟

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالجبیست

۳

علاوہ ازیں جذبات کی مختلف اقسام ہیں۔ جوجذبہ رادھا کرشن کے ساتھ تھا وہ نفسانی خواہشات کی طرح کا جذبہ ہے اس قسم کے جذبہ میں اورمسیحیت کے مسیح کی محبت میں زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں صرف وہی شخص تمیز کرنے سے قاصر رہے گا جوعلم ودانش سے بالکل بے بہرہ ہے۔

حقیقت حُسن کی ان کے نہ پوچھئے کوئی مجھ سے
کہ سیاہ فام چہرے پر غازہ ملا ہواہے

۴

پس یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ مختلف مذاہب کے پرستاروں کے روحانی تجربات مختلف ہوتے ہیں۔" ہرایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے ۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لاسکتا اوربُرادرخت اچھا پھل نہیں لاسکتا" (لوقا ۶: ۴۳)۔ مذہب کے جس قسم کے اُصول ہوتے ہیں پرستاروں کے رُوحانی تجربات جذبات اورافعال بھی اُسی قسم کے ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ملُحد کا تجربہ اورایک بُت پرست کا تجربہ اورویدانتی کا رُوحانی تجربہ (جودنیا کومایا یا خیال کرتا ہے اوراپنے آپ کو خدا مانتا ہے)اورایک مسیحی خدا پرست کا روحانی تجربہ چاروں یکساں طورپر درست اورراست نہیں ہوسکتے کیونکہ ان جذبات میں باہمی تضاد اورتناقض ہے۔پس جب اثرات مختلف اورمتضاد ہیں توان اثرات کے علل اوراسباب یعنی مختلف مذاہب کے اصول کس طرح یکساں طورپر صحیح درست اورراست تسلیم کئے جاسکتے ہیں؟ ہمیں یادرکھنا چاہیے کہ :

گندم ازگندم بردید ۔جوز جو

جس طرح مختلف بیجوں سے مختلف پیداواریں حاصل ہوتی ہیں اُسی طرح مختلف مذاہب کے اُصول سے مختلف قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مختلف اعمال اورافعال سرزدہوتے ہیں۔ مختلف مذاہب کی پیروؤں کی ذہنیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ ۔

جمال ہنشیں درمن اثرکرد۔

پس ہم کو منطقی مغالطات اورعقلی محالات سے بچنا چاہیے۔ اوراس امر کوتسلیم کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ مختلف مذاہب یکساں طورپر حق صحیح درست اورراست ہرگزنہیں ہوسکتے۔

۵

چونکہ ہندومت اورمسیحیت کی عبادت کے جذبات میں فرق ہے لہذا سیدنا مسیح کے حلقہ بگوش کے روحانی تجربہ میں اوربُت پرست مذاہب کے پیروؤں کے روحانی تجربہ میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔اگرتم روئے زمین کے مذاہب کی تاریخ کی ورق گردانی کروتوتم کو اس اونچائی کا روحانی تجربہ کہیں نہ ملیگا۔ مسیحی روحانی تجربہ کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اس کے تجربہ کرنے والوں نے اپنی گرانمایہ عمروں کوخلق خدا کی خدمت میں صرف کردیا۔کس مذہب کی تاریخ میں تم کو بنی نوع انسان کے بے ریا خدمت کرنے والوں کے گروہوں کے گروہ ملیں گے جن کی زندگی کا وحد مقصد بدنصیبوں درماندوں ،مظلوموں اوربے کسوں کی چارہ سازی اورخدمت گزاری ہو؟اپنے وطن ہندوستان کو لے لو کس مذہب نے ہمارے ملک کے بے کسوں کے لئے مسیحی کلیسیا کی مانند اس قدر ہسپتال سکول کالج اوربیوہ خانے یتیم خانے وغیرہ کھول رکھے ہیں؟ مسیحیت کے سوائے کس مذہب نے ہمارے وطن کی گری ہوئی بدکارعورتوں کو سنبھال کران کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ ازسرنوزندگی بسرکرسکیں؟ کس مذہب نے مسیحیت کی مانند جرائم پیشہ قبائل کو ازسرنوانسان بنادیا ہے؟ مسیحیت کے علاوہ کس مذہب نے کوڑھیوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے ؟ہندومت نے انیس کروڑانسان کو اُچھوت اورناپاك قراردے کر صدیوں تك اُن کو حیوان سے بدترحالت میں رکھا۔ اسلام نے ایك ہزارسال میں ان بدقسمت لوگوں کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ دکھایا۔ ہندومت کے عقائد نے ان کی زندگی کے نخل کوماردیا کیونکہ ان میں بطالت کا زہر موجود ہے۔ لیکن مسیحیت کے عقائد نے اپنے مقلدین میں ان بدنصیبوں کی فلاح اوربہبودی کی تڑپ ڈال دی۔ اورپچاس سال کے اندراندران میں سے لاکھوں کو جوحیوان تھے ازسرنو انسان بنادیا اورذات پات کی تباہ کن امتیازات کویکسر مٹاکر سب کوخدا کا فرزندمسیح کا عضو اورخدا کی بادشاہی کاوارث بنادیا۔

٦

ہندومت میں پرماتما صفات سے معرا ہے اوردیوتاؤں کو پرماتما کا مظہر اوراوتار ماناجاتا ہے۔ لیکن جب ہم ان دیوتاؤں کی

صفات پرنظر کرتے ہیں تووہ ایسی مخربِ اخلاق ہیں کہ اگران پر عمل کیا جائے توہر انسان چاہِ ضلالت میں گریگا ۔ کرشن کے جس تصور نے اہل ہنود کے عوام الناس کے دلوں کو موہ رکھا ہے وہ بھاگوت گیتا کا کرشن نہیں ہے جوفلسفیانہ درس دیتا ہے بلکہ پرانوں کا کرشن ہے جو بندرابن کے جنگلوں میں گوپیوں کے ساتھ لیلا کرتا تھااوراس تصور نے عوام الناس کے دلوں میں گھر کررکھا ہے۔ لاکھوں گیت اس تصور کے گواہ ہیں جوزبان زدِ خاص وعام ہیں اورہولی کا تہوارہرسال ہم کو اس تصوراورلیلا کی یاد دلاتا ہے۔یہ بات ظاہر ہے کہ وہ جوگوپیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اس بات کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا کہ گنہگار انسان کوگناہ کے آہنی پنجہ سے چھٹکارا دلاسکے۔ پس ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تمام مذاہب برابرطورپر عبادت گزاروں کے جذبات کومشتعل کرسکتے ہیں۔ بفرض محال اگرمذہب کا واحد کام جذبات کو برانگیختہ کرناہی ہو۔ تاہم اس کے وسائل کے مراتب ودرجات میں بعد المشرقین ہے۔اندریں حالات ہم تمام مذاہب کویکساں طورپرکس طرح برحق قراردے سکتے ہیں؟

۷

جولوگ یہ کہتے ہیں کہ عبادت میں اصلی شے عابد کا جذبہ ہے اورہم کو اس بات کی پروانہیں کرنی چاہیےکہ یہ جذبہ کس شے سے ظہور پذیر ہوتا ہے ان کو ہم مرحوم لارڈمارلے کے خیالات سے تعارف کرانا چاہتے ہیں جو خدا کی ہستی کے قائل نہ تھے۔ مرحوم کہتے ہیں۔

" اس قسم کے خیال سے لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اوربعض مہاتما پرش بھی اس قسم کی دلیل سے اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے آپ کو یقین دلالیاہے کہ مذہبی جذبہ کی زندگی اعلیٰ ترین قسم کی زندگی ہے۔ جس کا نہ عقل کے ساتھ تعلق ہے اورجس میں نہ تاریخ کا دخل ہے لیکن انسان کی روحانی زندگی کو نہ صرف جذبہ کی ضرورت ہے بلکہ صحیح رہنمائی اورہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ ہماری اندرونی زندگی کو نہ صرف جذبات کی طاقت کی ضرورت ۔ بلکہ ضمیر کی روشنی کی اُس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ جذبہ کی ہدایت اورضمیر کی روشنی صرف عقل کے نُور کے وسیلے حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ عقل اپنا نور تب ہی عطا کرسکتی ہے جب اس کا آزادانہ استعمال کیا جائے۔پراگروہ متضاد قضایا کوبرابر طورپر صحیح مانا جائیگا توعقل کس طرح آزادانہ کام کرسکیگی۔ ایسے انسان کے لئے اُمید ہوسکتی ہے جودلیرانہ طورپر اُس نتیجہ پر قائم رہنے کا عزم بالجزم کرلے جوصغریٰ اورکبریٰ قضایا سے علم منطق کے قوانین کے مطابق نکلتاہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ جوشخص حق کے ساتھ کھیلتاہے خواہ وہ کسی ارادے اورنیت سے ایسا کرتاہے وہ انسانی ترقی کی زندہ طاقتوں کے ساتھ کھیلتاہے"۔

John Morley, On Compromise, Ch.3

پس اگرہم مذہب کے معاملہ میں صرف جذبات کو ہی دخل دیں اورعقل کوخارج کردیں توہم بقول مرحوم مارلے "انسانی ترقی کی زندہ طاقتوں کے ساتھ کھیلتے ہیں" لیکن اگرکوئی ہندوستانی اس قسم کا وطیرہ اختیار کرتا ہے اورہندوستانی قوم کی زندہ طاقت کے ساتھ کھیلنے کا مرتکب ہوتا ہے تووہ حقیقت میں اپنے ملك اورقوم کے ساتھ غداری کرتا ہے۔

۸

جہاں تک مسیحیت کا اس سوال سے تعلق ہے یہ مذہب ہندودھرم کے مختلف فرقوں کی طرح ایک فرقہ یا مت نہیں ہے۔ ہم سیدنا مسیح کی اُس طریقہ اورانداز سے پوجا نہیں کرتے جس طرح ہندوبُت پرست بُتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا کامل طورپر سیدنا مسیح اور صرف سیدنا مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ پس اس کے سامنے باقی تمام نام نہاد اوتاراورمظہر ناقص غیر مکمل اورہیچ ہیں۔مسیح اور صرف سیدنامسیح خدا کا حقیقی اورکامل مکاشفہ ہے پس اس پر ایمان رکھنا خدا پر ایمان رکھنا ہے اورخدا پر ایمان رکھنا مسیح پر ایمان رکھنا ہے۔ اصلی اوربنیادی سوال یہ ہے کہ خدا کیا ہے اوراس کا حقیقی مکاشفہ کس وسیلے سے ہوا ہے؟

ہندودھرم کہتا ہے کہ خدا کوہم جان نہیں سکتے۔ کالی اورکرشن، رام اورشو، مسیح اوربُدھ سب یکساں طورپر اس کوظاہر کرتے ہیں ۔ چنانچہ پروفیسر رادھا کرشن اپنی کتاب " ہندو ویو آف لائف" میں سنکسرت کے ایک شلوك کاذکرکرتے ہیں جس میں لکھا ہے:

" ہر ی جوتینوں جہانوں کا حاکم ہے جس کو شومت وائے شو"کے نام سے ویدانتی " برہما"کے نام سے اور بُدھ مت وائے بدُھ کے نام سے اورنیایکی" عامل" یا چیف ایجنٹ کے نام سے اور جین والے" آزادا شدہ"کے نام سے اوررسوم پرست " قانون کا اصل کہہ کر پکارتے ہیں ہماری دعاؤں کوسنے"(صفحہ ۴۶)۔

لیکن عقل سلیم ہم کوبتلاتی ہےکہ خدا برابرطورپر کالی اورکرشن، رام اورشِو، مسیح اوربُدھ میں ظاہر نہیں ہواکیونکہ ان کے اوصاف اقوال وافعال ایک دوسرے سے کلیتہً مختلف اورمتضاد ہیں۔ پس یاوہ کالی میں ظاہر ہوا ہے یا مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ یاوہ بُدھ میں ظاہر ہوا ہےیا مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ یاوہ رام میں ظاہر ہوا ہے یا وہ مسیح میں ظاہر ہوا ہے ۔ یا وہ کرشن میں ظاہر ہوا ہے یاوہ مسیح میں ظاہر ہوا ہے۔ پس اگرہم خدا کودیکھنا چاہتے ہیں توکالی اورمسیح دونوں میں برابرطورپر نہیں دیکھ سکتے۔ رام اورمسیح دونوں میں نہیں دیکھ سکتے ۔ کرشن اورمسیح دونوں میں یکساں طورپر خدا کا کامل مکاشفہ ہونا ایک محال عقلی ہے کیونکہ ان کے

اوصاف جُداگانہ ہیں۔ پس یا تومسیح خدا کا کامل مکاشفہ ہے یا کرشن خدا کاکامل مکاشفہ ہے دونوں کا خدا کا کامل مکاشفہ ہونا اجتماع الضدین ہے۔ چونکہ انجیل کے مطالعہ سے ہماری عقل ہم کو بتلاتی ہے کہ سیدنا مسیح خدا کاکامل مکاشفہ ہے لہذا ہم یہ مانتے ہیں کہ:

"کسی دوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں کیونکہ آسمان کے نیچے بنی آدم کو کوئی دوسرا نام نہیں دیا گیا جس کے وسیلے سے ہم نجات پاسکیں(اعمال ۴: ۱۲)۔

۹

مسیحیت اپنے اوائل زمانہ میں مذاہب باطلہ پرغالب آئی کیونکہ اس کا ایمان ایک تواریخی ہستی پر تھا۔ موجودہ ہندو مصلحین کی طرح اُس زمانہ کے بُت پرست پنڈت اپنے دیوی دیوتاؤں کے بیہودہ اورواہیات قصص کو تمثیلی رنگ میں پیش کیا کرتے تھے اوراس قسم کی تاویل تفسیر کرکے اپنے پیروؤں کے لئے اخلاقی سبق نکالتے تھے۔ لیکن ہرزمانے کے سلیم الطبع اشخاص کی اخلاقی حِس اس قسم کی پادرہواتاویلات سے بغاوت کرتی ہے اوریہی حال ہمارے ملک کے روشن طبع نوجوانوں کا ہے۔ انسانی روح اپنے ہی تخیل پرزندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک تواریخی ہستی کی خواہش ہے۔ جو اُس کا حقیقی نصب العین ہوسکے۔ ہندومت کے پاس اس قسم کی کوئی تواریخی ہستی نہیں ہے۔ لیکن مسیحیت کا بانی ایک حقیقی تواریخی شخص تھا۔ ہندومت اوردیگر بت پرست مذاہب کے اوتارانسانی قوتِ متخیلہ کا نتیجہ ہیں پس وہ محض وہمی صورتیں اورظہورہیں لہذا اُن میں اورسیدنا مسیح میں بین تفاوت ہے اوریہ فرق محض درجہ کا نہیں کہ کوئی کہہ سکے کہ فلاں دیوتا مسیح سے کم رُوحانی ہے اورمسیح فلاں دیوتا ہے۔ مثلاًکرشن وغیرہ سے زیادہ بڑا ہے۔ یہاں" کم" اور" زیادہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ،کیونکہ دونوں میں درجہ کا فرق نہیں بلکہ حد اورقسم کا فرق ہے۔ سیدنا مسیح ایک اوریہی قسم کی شخصیت رکھتا ہے۔کرشن اورمسیح میں نوع اورقسم کا فرق ہے۔ پس مسیح نے ہرملک اورزمانہ کے بے شمارافراد کے دلوں کومسخرکر رکھا ہے۔ اہلِ ہند بھی اس سے مستثنیٰ نہیں چنانچہ مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ:

" مسیح میرے دل میں دنیا کے عظیم الشان معلموں میں سے ایک کی جگہ رکھتا ہے اوراس نے میری زندگی کوبہت متاثر کیا ہے[3]۔

---

[3] Andrews, Mahatma Ghandi's Idea,p92

لیکن عقل سلیم سیدنا مسیح کو دنیا کے دیگر معلموں ،نبیوں معبودوں اوردیوتاؤں کی قطارمیں شمار نہیں کرسکتی۔ اورنہ مسیحیت کی نسبت یہ کہہ سکتی ہے کہ جس طرح دیگر مذاہب اندھیرے میں ٹٹولتے پھرتے ہیں اسی طرح وہ بھی شب کی تاریکی میں خداکوٹٹولتی پھرتی ہے۔ ہم یہ ماننے پر مجُبور ہیں کہ سیدنا مسیح خدائے واحد کا قطعی،آخری،کامل ،اکمل اورلاثانی مکاشفہ ہے۔

کیاکل مذاہب ایک خدا کی طرف جانے کے راستے ہیں

جواصحاب اس اُصول کی تبلیغ کرتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں وہ بالعموم عوام الناس کے سامنے یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ مختلف مذاہب مختلف راستوں کی طرح ہیں جوایک ہی شہر کی طرف جاتے ہیں ۔ جس طرح ہرراہ ایک ہی شہر کی جانب لے جاتی ہے اُسی طرح ہرمذہب ایک ہی خدا کی طرف لے جاتاہے جس طرح چلنے والا جس راہ کو چاہے اختیارکرلے اسی طرح ہرشخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس مذہب کوچاہے اختیارکرلے۔ وہ کہتے ہیں کہ موٹی سے موٹی عقل والا شخص بھی یہ سمجھ سکتاہے کہ خدا ایک ہی ہے اُس کو ایک شخص پرمیشور کہتاہے تودوسرا اُسی کو واہگرو کہتاہے۔ کوئی اس کو اللہ کہتاہے کوئی برہما اورکوئی اس کو خدا کے نام سے موسوم کرتاہے۔ غرضیکہ ہستی ایک ہی ہے جس کی سب پرستش کرتے ہیں ۔ صرف اُس ایک ہستی کے نام مختلف ہیں اورنام کی نسبت جھگڑنا کسی عقلمند کا کام نہیں۔

وہی جا پہنچتی ہیں کہ کعبہ کوزاہد
نکلتی ہیں راہیں جو کوئے بتاں سے

چنانچہ مسٹرگاندھی کہتے ہیں

خدا کے ہزاروں نام ہیں بلکہ حق تویہ ہے کہ اس کا کوئی خاص نام نہیں۔ہم کویہ اختیار ہے کہ جس نام سے چاہیں اس کو پکاریں۔ بعض اس کو رام کہتے ہیں۔ بعض اس کو کرشن کہتے ہیں بعض اس کوخدا کہتے ہیں ۔لیکن سب ایک ہی رُوح کی پرستش کرتے ہیں۔ جس طرح تمام غذائیں ہر شخص کومرغوب نہیں ہوتیں اسی طرح خدا کے سب نام ہر شخص کوپسند نہیں ہوتے لیکن ہر شخص کویہ حق حاصل ہے کہ جونام اس کو پیارا لگے وہ اختیار کرلے چونکہ وہ علیم وخبیر ہے اورہماری دلی آرزوؤں سے واقف ہے۔ پس وہ ہماری دعاؤں کا جواب بھی دیتاہے"۔(ہندوویو آف لائف صفحہ ۳۷)۔

جنوبی ہند کا ایک ہند شاعر کہتا ہے" جس طرح ہرپہاڑی ندی مختلف اطراف سے ایک ہی سمندرمیں کرتی ہے۔ لیکن ہرندی کے مختلف نام ہوتے ہیں اُسی طرح ہر ملک کے انسان ایک ہی خدائے کبیر وعظیم کے حضور جھکتے ہیں گووہ اُس کومختلف ناموں سے پکارتے ہیں"(ایضاً صفحہ ۴۷)۔ایک اورہندومصنف لکھتا ہے کہ جس طرح مختلف رنگ کی گائے ہوتی ہیں کوئی کالی ہوتی ہے کوئی سفید ، کوئی لال اورکوئی بھورے رنگ کی ہوتی ہے لیکن ہررنگ کی

گائے کا دودھ ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے اسی طرح مختلف اقوام کے لوگوں کے دیوتا بظاہر مختلف ہوتے ہیں لیکن درحقیقت پرستش اسی ایک خدا کی ہوتی ہے۔

همه کس طالب یارندچه ہشارچه مست
همه جاخانه عشقست چه مسجدد کنست

۱

مذکورہ بالا نظریہ بظاہر نہایت دلکش اورصلح کل معلوم ہوتا ہے۔ اوراگریہ نظریہ عقل کے معیار پرپورا اُترسکے توہم کواس کے ماننے میں ذراتامل نہیں ہوسکتا۔ لیکن جب ہم مثال کی تہ کو" پہنچتے ہیں تواس کی خامی ہم کونظر آتی ہے۔ ازروئے منطق کوئی مثال عقلی دلیل کی جگہ نہیں لے سکتی ۔پس ہرعقیل شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کریگا کہ آیا مذکورہ بالا مثالیں مضمون زیربحث پر صادق بھی آتی ہیں یا نہیں۔ کیا یہ بات درست ہے کہ مختلف مذاہب میں صرف خدا کے نام کی نسبت فرق ہے اوربس؟ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تمام مذاہب خدائے واحد کے قائل نہیں اوراگر بفرض محال ہم یہ مان بھی لیں کہ تمام مذاہبِ عالم ایک ہی خدا کی ہستی کے قائل ہیں تو ان میں ذاتِ الہٰی کے تصورات کے متعلق اختلاف ہے اوریہ اختلافات محض سطحی اورظاہری نہیں بلکہ بنیادی اوراُصولی اختلافات ہیں جوکسی صورت بھی ازروئے اُصول منطق وفلسفہ ایک دوسرے سے منطبق نہیں کئے جاسکتے ۔ ہم آگے چل کر انشا اللہ اس پر مفصل بحث کریں گے۔ یہاں یہ کہہ دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ جوشخص ویدوں کے پرمیشورکومانتا ہے وہ ایک ایسی ہستی کا قائل ہے جس کو وہ شخص نہیں مان سکتا جوقرآن کے اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اورجوشخص قرآن کے اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ ایک ایسی ہستی پریقین رکھتا ہے جس کو وہ شخص قبول نہیں کرسکتا جوانجیل کے خدا کو مانتاہے۔ پس یہ قول بالکل غلط ہے کہ ہرشخص ایک ہی ہستی کو مانتا ہے جس کے نام مختلف ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف محض ناموں کا نہیں بلکہ ذات وصفات کا اختلاف ہے جو بنیادی اوراُصولی ہے۔ قرآن کے اللہ کی پرستش کرنے والا ویدوں کے پرمیشورکی ذات وصفات رکھنے والی ہستی کی پرستش نہیں کرسکتا اورانجیل کے خدا پر ایمان لانے والا قرآن کے اللہ کی ذات وصفات کوناقص اورغیرمکمل قراردیدگا لہذا وہ اس کی پرستش نہیں کرسکتا ۔ پس یہ بات غلط ہے کہ سب مذہب والے ایک ہی ہستی کی پرستش کرتے ہیں۔

مختلف راستوں کی جومثال ہمارے مخاطب دیتے ہیں وہ بھی مذاہب پر صادق نہیں آسکتی۔کیونکه یه مثال فرض کرلیتی ہے که خدا کسی پہاڑیا شہر کی طرح ایک جگه قائم اورساکن ہے اوراس کی ذات کسی شہر کی طرح غیر متحرک غیرارادی اورغیر مشخص ہے اورجس طرح مختلف لوگ مختلف راستوں سے کسی شہر میں پہنچ جاتے ہیں اُسی طرح مختلف اقوام وممالک مختلف راستوں اورطریقوں سے خدا کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں۔ اس نظریه کے مطابق خدا شہر کی طرح ساکن رہتا ہے اورکُل ممالک واقوام کے انسان اپنی کوشش سے خدا کے پاس آتے ہیں اورجس طرح شہرکسی کے پاس چل نہیں جاتا اسی طرح خدااپنی طرف سے انسان کی نجات کے لئے کسی قسم کی کوشش نہیں کرتا۔ پریه بات بدیہی طورپر غلط اوربے بنیاد ہے که خدا انسان کی نجات کے لئے کچھ نہیں کرتا اورکسی شہریا پہاڑ کی طرح بے بس اورکسی فعل مجہول کی طرح مظہر مفعولیت مسند لیه ہے۔ خدا نه صرف ہمارا خالق اورپروردگار ہے بلکه انجیل جلیل کی تعلیم کے مطابق وہ بنی نوع انسان کا باپ ہے جس کی ذات محبت ہے۔ محبت کا یه خاصه نہیں ہوتا که غیر ارادی اورغیر مشخص ہو بلکه محبت سے اراده اورفعل دونوں صادر ہوتے ہیں۔ خدا کے یه شایاں نہیں که اپنے گمراہ بیٹے کو صراط المستقیم پر لانے کی جانب سے بے نیاز ہوکر لاپرواہی اختیار کرے بلکه اس کی پدری محبت ہرممکن طورپر جدوجہد کرتی ہے که اس کا گم گشته فرزند چاہِ ضلالت سے نکلے۔ اوریه پدری محبت اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لئے ہر طرح کا ایثار کرنے کوتیار رہتی ہے۔ اوراس کو چین نصیب نہیں ہوتا جب تک که وہ اپنے مقصد میں کامیاب نه ہو جائے۔ پس مسیحیت ہم کویه تعلیم دیتی ہے که خدا اپنے فضل کا ہاتھ بڑھاتا ہے اوراس کی لازوال پدری محبت ایثار سے پیش قدمی کرکے گنہگار انسان کواپنی طرف کھینچتی ہے۔ پس انسان اپنی ذاتی کوشش سے خدا کی طرف نہیں آتا بلکه خدا کی ابدی محبت اُس کو بلاتی ہے۔ انسان اپنے ذاتی اعمال سے نجات نہیں پاتا تاوقتیکه پہلے سے خدا کا فضل اس کے شامل حال نه ہو اس سے پہلے که انسان خدا کی تلاش کرے۔ خدا انسان کی تلاش کرتا ہے ۔ یه واضح حقیقت مسیحیت کا اصل ہے چنانچه لکھا ہے:

" خدا محبت ہے۔۔۔جومحبت خدا کو ہم سے ہے وہ اس سے ظاہر ہوئی که خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکه ہم اس

کے سبب سے زندہ رہیں۔ محبت اس میں نہیں کہ ہم نے خدا سے محبت کی بلکہ اس میں ہے کہ خدا نے ہم سے محبت کی اورہمارے گناہوں کے کفارہ کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا" (۱یوحنا ۴: ۸ تا ۱۰)۔

" روح القدس جوہم کو بخشا گیا ہے۔ اس کے وسیلے سے خدا کی محبت ہمارے دلوں میں ڈالی گئی ہے کیونکہ جب ہم گنہگارہی تھے توعین وقت پر مسیح بے دینوں کی خاطر موا۔ خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پریوں ظاہر کرتا ہے ۔ باوجود خدا کے دشمن ہونے کے خدا سے اُس کے بیٹے کی موت کے وسیلے سے ہمارا میل ہوگیا" (روم ۵باب)۔

خدا نے مسیح کے وسیلے سے اپنے ساتھ ہمارا میل ملاپ کرلیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے مسیح میں ہوکر اپنے ساتھ دنیاکا میل ملاپ کرلیا" (۲کرنتھیوں ۵: ۱۸)۔

" باپ کو یہ پسند آیا کہ مسیح کے خون کے سبب صلح کرکے سب چیزوں کا اسی کے وسیلے سے اپنے ساتھ میل کرے خواہ وہ زمین کی ہوں خواہ آسمان کی" (کلسیوں۱: ۱۹)۔

بذاتِ خود ہم انسان اس لائق نہیں کہ اپنی طرف سے کچھ خیال بھی کرسکیں بلکہ ہماری لیاقت خدا کی طرف سے ہے" (۲کرنتھیوں ۳: ۵)نجات انسان کے اعمال کے سبب نہیں بلکہ ایمان کے وسیلے خدا کے فضل سے ملی ہے اوریہ انسان کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی بخشش ہے" (افسیوں ۲: ۸)۔

ایں سعادت بزوربازونیست
تانہ بخشدا خدائے بخشندہ

انسان کی نجات اس کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ نہیں بلکہ خدا کی بخشش ہے۔ غیرارادی غیرمشخص اورساکن ہستی کا عین نقیض ہے پس جس تصورِخدا پر شہر اوراس کے مختلف راستوں کی مثال قائم کی گئی ہے وہ تصوربالکل باطل اورحقیقت سے کوسوں دُور ہے ۔ انسان مختلف راستوں سے چل کر خدا کے پاس نہیں پہنچتا بلکہ:

" خدا نے قدیم زمانے سے حصہ بہ حصہ اورطرح بہ طرح نبیوں کی معرفت کلام کرکے آخر کارہم کو بیٹے کی معرفت کلام کیا ہے (عبرانیوں ۱:۱)۔

خدا ساکن ہونے کی بجائے خود انسان کی خاطر مجسم ہوکر دنیا میں آیا اوریُوں اس کی لازوال محبت نے انسان کوبچانے کی خاطر پیش قدمی کی ۔ مسیحیت دیگر مذاہب کی طرح ایسا مذہب نہیں جس کوکسی ایک انسان نے یا انسان کےگروہ نے مسیح کے زیراثردریافت یا ایجاد یا وضع کیاہوبلکہ وہ خدا کی جانب سے ایک

مکاشفہ ہے جس کا مرکز مسیح ہے۔ مسیحیت کوئی ساکن نصب العین نہیں جس کو انسان نے غیر مکمل طورپر گویا تاریکی میں ٹٹولتے اپنی کوششوں سے حاصل کرلیا ہو بلکہ خدا نے خود اس میں اپنی ذات کوہم پرظاہر کیا ہے۔ بالفاظِ رپورٹ جلسہ یروشلیم:

" مسیح کی خوشخبری ہماری دریافت کا نتیجہ نہیں ہے اورنہ انسانی کوششوں سے حاصل کی گئی ہے ۔ اس کے برعکس وہ خداکا فضل ہے"۔

مسیحی ایمان یہ ہے کہ:

" اس خدائے قادر نے ہمارے لئے بڑے بڑے کام کئے"(لوقا۱: ۴۹)۔

جوانسانی ارادہ پر موقوف نہیں ۔ مسیحی اُس بات پر ایمان لاتے ہیں " جونہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے اورنہ انسان کےارادہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کامنبع اورسرچشمہ خودخدا کی ذات ہے"(یوحنا۱: ۱۳)۔

خدا باپ نے اپنی ازلی محبت کی وجہ سے اپنے فرزندوں کوبچانے کے لئے اپنا ہاتھ پھیلایاہے تاکہ ان کو اپنے لامحدود فضل سے نجات دے ۔الہٰی محبت نے انسا ن کو بچانے کی خاطر پیش قدمی کی۔ پس خدا کے پاس پہنچنے کےراستے مختلف نہیں بلکہ راہ ایک ہی ہے اوروہ محبت کی راہ ہے جو صراط مستقیم ہے۔ چنانچہ سیدنا مسیح نے خود فرمایا ہے کہ"

" راہ ،حق اورزندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیرباپ کے پاس نہیں آتا"(یوحنا ۱۴: ۶)۔

۳

جواصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ مذاہب افسانی کوشش کا نتیجہ ہیں وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ " مذہب" اور"کلچر" یاثقافت میں تمیزنہیں کرسکتے۔ وہ مذہب کوایک قسم کی کلچر خیال کرتے ہیں جس کو ترقی دینا انسان کا فرض ہے چنانچہ اخبار انڈین سوشل ریفارمربمبئی کا ایڈیٹر رقمطراز ہے کہ:

" بدھ اورکرشن جیسے عظیم الشان اُستادوں کی تعلیم کوہمیں قطعی سمجھ کر قبول نہیں کرنا چاہیے اس کےبرعکس ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی تعلیم کوایک قدم آگے لے جائیں تاکہ انسان نوع کی اخلاقی اورروحانی ترقی ہو"۔(مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۱ء)

لیکن مذہب کلچرنہیں ہے بلکہ وہ خدا کی جانب سے مکاشفہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ لکھوکھہا سال کی تلاش کے باوجود انسان

اپنی مساعی جمیلہ سے خداکا وہ علم حاصل نہ کرسکا جوہم کو سیدنامسیح کےذریعہ ملاہے۔ انسانی فطرت ہم کو وہ معرفتِ الہٰی نہیں بخش سکی جومافوق الفطرت طاقت نے عطاکی ہے یہی وجہ ہے کہ جومکاشفہ ہم کو سیدنا مسیح کے ذریعے ملا وہ لاثانی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دیگرمذاہب میں اوراس مکاشفہ میں صرف درجہ کافرق نہیں بلکہ نوعیت کا فرق ہے۔ دیگرمذاہب مسیحیت کی قسم کے مذہب نہیں ہیں۔ مسیحیت بے نظیراوربے عدیل ہے کیونکہ وہ خدا کی جانب سے مکاشفہ کی صورت میں ملی ہے۔دیگرمذاہب ہم کو صرف اُس وقت تک بھلے معلوم ہوتے ہیں جب تک کہ اُن کو انجیل جلیل کی روشنی میں نہ لایا جائے لیکن جونہی ہم ان کو کلمتہ اللہ کے جلال کی روشنی میں دیکھتے ہیں ہم کوانسانی کوششوں اورالہٰی مکاشفہ میں فرق فوراً معلوم ہوجاتا ہے اورہم کویہ علم ہوجاتا ہے کہ ان مذاہب میں درحقیقت کوئی مکاشفہ نہیں ہے بلکہ مسیحیت ہی کی طرف سے ایک کامل اوراکمل مکاشفہ ہے۔

وہ بھی تھی اک سیمیاہ کی سی نمود

صبح کوراز مہ داختر کھلا

پس مسٹرگاندھی کا یہ خیال کہ انسان خود اپنی کوششوں سے خدا کو حاصل کرسکتا ہے غلط ہے اورانجیل جلیل کے خلاف ہے۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں :

"جوبات میں حاصل کرناچاہتاہوں اورجس بات کی تحصیل میں گذشتہ تیس سالوں سے میں کوشاں رہاہوں وہ اپنے نفس اورذات کی پہچان ہے یعنی میں خدا کو روبرو دیکھنا چاہتاہوں اوریہی لکھش ہے"۔

لیکن باوجوداپنی تیس سالہ پے درپے مخلصانہ کوششوں کے آپ کوآخرالامر اقرارکرنا پڑا" میں نے خدا کو حاصل نہیں کیا لیکن میں اس کی تلاش میں ہوں۔ میں اس کو نہیں جانتا"۔ جب مہاتماؤں کا یہ حال ہے تویہ مادشماکس شماروقطارمیں ہیں۔ ہراُس شخص کا یہی تجربہ ہے جوصرف اپنی مساعی جمیلہ کے ذریعہ خدا کو تلاش کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے برعکس ہرمسیحی کوخداکاذاتی تجربہ حاصل ہے کیونکہ وہ اُس "آسمانی بخشش کا مزہ چکھ چکے ہیں" (عبرانیوں ۶: ۴)۔جس سے گاندھی جی جیسے مہاتما پُرش ناواقف اوربے خبرہیں سچ ہے :

"جو آسمان کی بادشاہت میں چھوٹا ہے وہ اس (گاندھی جی) سے بڑا ہے (متی ۱۱: ۱۱)۔

گاندھی جی کا بنیادی نظریہ غلط ہے کہ خدا ایک غیر مشخص ہستی ہے جس کو وہ کبھی خدا اورکبھی ست اورحق کہتے ہیں اوراسی بنیادی اوراُصولی غلطی کی وجہ سے مہاتما جی راہ حق سے کوسوں دُورجاپڑے ہیں۔

۵

تاریخ ہم کوبتلاتی ہے کہ جب مسیحی مبلغین گذشتہ صدی میں ہمارے ملک ہندوستان میں وارد ہوئے توہندوستان کی حالت بعینہ رُومی یونانی دنیا کی سی حالت تھی جس کاذکر ہم اپنے رسالہ نورالہدیٰ میں کرچکے ہیں۔ مقدس پولوس اُس زمانہ کی حالت کا نقشہ دیکھ کر فرماتے ہیں:

"جب وقت پورا ہوگیا توخدا نے اپنے بیٹے کوبھیجا تاکہ ہم کو لےپالک ہونے کادرجہ ملے"(گلتیوں ۴: ۴)۔

رسول مقبول کا مطلب یہ نہیں تھاکہ اُس زمانہ میں دنیا اس قدرترقی کرگئی تھی کہ اب وہ اس قابل ہوگئی تھی کہ ایک نیا قدم آگے بڑھا سکے۔ جس شخص نے ہماری کتاب نورالہدیٰ کوپڑھا ہے اس پر یہ واضح ہوگیاہوگاکہ اُس زمانہ کی دنیا تاریکی اوربُت پرستی اوراوہام پرستی وغیرہ میں پڑی کراہ رہی تھی پس رسول مقبول کا ان الفاظ سے یہ مطلب تھا کہ دنیا کی روحانی حالت کا دیوالہ نکل گیا تھا اوراس کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ صرف اللہ کی ذات ہی اس کو بچاسکتی تھی۔ پس خدا نے اپنی لازوال محبت کی وجہ سے پیش قدمی کرکے دنیا کو بچایا۔ اسی طرح اب خدا ہندوستان کو بچانا چاہتا ہے۔ اوریہ محض اس کے فضل وکرم کی وجہ سے ہے۔ مسیحیت ہندومت کا یہ نظریہ قبول نہیں کرسکتی کہ انسانی فطرت میں کاملیت نہاں اورپوشیدہ ہے جوخاطر خواہ ماحول میں نمودارہوجاتی ہے بلکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ انسان کے دل ودماغ ترقی نہیں کرسکتے تاوقتیکہ ان میں مافوق الفطرت زندگی سرایت نہ کرے۔ اوریہ زندگی صرف سیدنا مسیح ہے کیونکہ صرف اسی میں" زندگی ہے اوریہ زندگی انسان کو منورکردیتی ہے"(یوحنا۱: ۴)۔

ہندومذہب کانظریہ یہ ہے کہ انسانی کالبد میں الوہیت موجود ہے۔ اوریہ الوہیت انسانی فطرت کی وجہ سے انسان میں موجود ہے لیکن مسیحیت اس قسم کے خیالات کی قائل نہیں ہوسکتی۔ اس نظریہ کے برعکس اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا

روحانی کمال اس بات پر منحصر ہے کہ وہ خدا کا فرزند ہو۔ انسان کوفطرتاً خدا کے فرزند ہونے کا حق حاصل نہیں پس وہ اپنی فطرت اورسرشت کی وجہ سے اوجِ کمال کونہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جومنجئی عالمین کواپنا نجات دہندہ قبول کرتے ہیں:

"خدا ان کو اپنے فرزند بننے کا حق بخشتا ہے یعنی اُن کو جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ سرشتِ انسانی کی وجہ سے اورنہ جسمانی اقتضاؤں کی وجہ سے اورنہ انسانی ارادہ کی وجہ سے بلکہ خدا کے فضل کی وجہ سے کمالیت حاصل کرتے ہیں (یوحنا۱: ۱۳)۔

صرف خدا کی روح کے وسیلے انسان ازسرِ نوپیدا ہوسکتا ہے اورجب تک وہ نیا مخلوق نہ بن جائے وہ خدا کی بادشاہی میں داخل نہیں ہوسکتا (یوحنا ۳ باب)۔

پس مسیحیت کا مکاشفہ خدا کے فضل اورکرم کا نتیجہ ہے وہ انسانی کدوکاش کا نتیجہ نہیں بلکہ الہٰی تلاش کا نتیجہ ہے جوخدا گنہگارانسان کی خاطر اپنی ازلی اورابدی محبت کی وجہ سے کرتا ہے۔

کیا خدا مجرد تصور ہے

مسٹر گاندھی کا نظریہ جووہ خدا کی نسبت رکھتے ہیں سرے سے غلط ہے۔ آپنے ایک مشنری سے اثنائے ملاقات میں کہا:

" میں نہیں جانتا کہ خدا کوئی شخصیت رکھتاہے۔ میرے لئے حق کا مجرد تصور خدا ہے۔ خدا محض ایک تصور ہے"(ہریجن ۲۳مارچ ۱۹۴۰ء صفحہ ۵۵)۔

لفظ" خدا "مہاتما جی کی زبان پر بہت جاری رہتا ہےلیکن آپ کے نزدیک خدا اورحق دونوں ایک ہیں اوروہ محض مجرد تصورہیں۔ خدا کی پروردگاری کا جوتصوررکھتے ہیں وہ بھی اسی قسم کا ہے۔ ان کے خیالات کی تہ میں اُپنشدوں کا نظریہ ہے جویہ مانتاہے کہ برہما ایک غیر مشخص طاقت یاجوہر ہے جوکائنات میں ساری اورطاری ہے۔ویدانت کے اُصول کے مطابق وجودِمطلق ایک ایسی غیر مشخص ہستی ہے جو اخلاقی صفات سے متصف نہیں ہے لیکن مسیحیت کے مطابق خدا ایک ہستی ہے جس کی ذات محبت ہے اوریہ ہستی اخلاقیات کا سرچشمہ ہے ۔ کیا اس سے زیادہ بدیہی فرق ممکن ہے ؟پھر ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں متضاد نظریہ یکساں طورپر صحیح اوردرست ہیں اورفرق صرف ناکام ہے؟دونوں نظریوں کویکساں طورپر صحیح قراردینا محال عقلی ہے۔

بلاآخر طوہاً وکرہاً مسٹرگاندھی کوتسلیم کرنا ہی پڑا کہ " اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف مذاہب میں لفظ" خدا" کے تصور الگ

الگ ہیں پھر کیا ہوا؟گویا آپ کی منطق میں اجتماع الضدین کوئی بات ہی نہیں!

جوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی

اس نظریہ کا نتیجہ

چونکہ مسٹرگاندھی کا تصورِخدا کا نظریہ غلط ہے لہذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جونظریہ آپ اپنی آدم کے متعلق رکھتے ہیں وہ تصوربھی غلط ہو۔ جب خدا شخصیت نہیں رکھتا تووہ نوع انسان کا باپ کس طرح ہوسکتا ہے اوربنی آدم ایک دوسرے کے ساتھ اُخوت ومساوات کا سلوک کس طرح کرسکتے ہیں؟یہی وجہ ہے کہ مسٹرگاندھی کے پاس انسانی فطرت کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں اوروہ اپنے مقلدین کواپنے بدقسمت بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے پر اُبھارنہیں سکتے۔ انجیل جلیل میں سیدنا مسیح نے صاف فرمایا ہے کہ:

"جونیک سلوک تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک ساتھ کیا وہ خدا کے ساتھ کیا"اورجوبدسلوک تم نے ان سب چھوٹوں میں سے کسی ایک کے ساتھ نہ کیا وہ تم نے خدا کے ساتھ نہ کیا"(متی ۲۵باب)۔

لیکن چونکہ مسٹرگاندھی کے مذہب کی تعلیم میں اس قسم کے محرکات کے لئے جگہ نہیں وہ نہیں جانتے کہ کیا کریں۔اس کا اصلی باعث یہ ہے کہ تصورِ الہٰی کے نظریہ کا اثرہماری انفرادی اوراجتماعی زندگی کے تعلقات پر طبعاً پڑتاہے۔ پس قدرتی طورپر ہندومت کے پیروانسانی تعلقات کواُس نقطہ نظر سے نہیں دیکھ سکتے جس نظر سے مسیحی دیکھتے ہیں۔ پس ہندومت کا لازمی نتیجہ ذات پات کی تمیزاوراُچھوت اقوام کا وجود وغیرہ ہے۔ لیکن مسیحیت کا لازمی نتیجہ اُخوت ومساوات ہے۔ ہندو دھرم اپنے اُصولوں پر قائم رہ کر ان اصلاحی کوششوں میں جواُس کے معاونین سرتوڑکر رہے ہیں حصہ نہیں لے سکتا۔ چنانچہ اکھیلا بھاریہ سناتن دھرم ودوات پری شاد نے اپنے اجلاس منعقدہ دسمبر۱۹۳۷ء میں اچھوتوں کے کنوؤں سے پانی بھرنے ۔ مندروں میں داخل ہونے۔ذات پات اورشدھی وغیرہ کے مسائل پر پانچ دن متواتر بحث اورغوروفکر کرکے یہ قرار دیاکہ ان اُمورمیں دخل اندازی کرنا ہندومت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ آل انڈیا سناتن دھرم کانفرنس نے ۱۹۳۷ء میں اچھوتوں کےمندروں میں داخلہ کی نسبت یہ فیصلہ صادرکیاکہ ہندوشاستروں کی رُو سے وہ مندروں میں داخل نہیں ہوسکتے۔ ان کا متفقہ فتویٰ یہ تھا

کہ یہ باتیں ہندواصول کے مطابق جائز ہیں اوران میں دست اندازی کرنا ہندومت کے اُصول کے ساتھ کھیلنا ہے! ان کانفرنسوں کے اجلاس کے متعلق لبرل ہندوازم کے اخبار"بھارت دھرم" کا ایڈیٹر رقمطراز ہے کہ:

" ہمارا یہ گمان تھا کہ ممکن ہے کہ موجودہ حالات کومدِنظر رکھ کرہمارے پنڈت صاحبان کسی اورنتیجہ پر پہنچ جائیں۔ اُن کوکم ازکم اس بات کا خیال کرنا چاہیے تھا کہ ہزاروں لوگ اپنی روحانی بھوک کی وجہ سے ہمارے مذہب کو ترک کرکے دیگر مذاہب میں داخل ہورہے ہیں لیکن غلط بودآنچہ ماپند اشتیم۔ ہمارے پنڈت صاحبان شاستروں کے مُردہ الفاظ کواوردقیانوسی آیات کونہیں چھوڑتے اورنہ وہ موجودہ نسل کی روش پر غورکرتے ہیں۔ وہ ہم کو یہ خیال کرنے پر مجبورکررہے ہیں کہ جس فضا میں یہ مذہب پھلتا پھولتا ہے۔ اس میں ہم سانس نہیں لے سکے۔ اوراُن کے مذہب میں دورِحاضرہ کے لئے کوئی پیغام نہیں"۔

Quoted in the Guardian, March 3.1938

حق تویہ ہے کہ ہندومت اپنے پیروؤں پر افیون کا ساثر رکھتا ہے۔ اُس نے ہمارے ہموطنوں کوخوابِ عقلت میں ایسا سُلادیا ہے کہ اُن کو بیدارکرنا جان جوکھوں کاکام ہوگیا ہے۔ ہمارے ہم وطن اس خواب گراں میں ہندوھرم کے اُصول کی وجہ سے پڑگئے ہیں۔ چنانچہ مسٹرگاندھی دھرم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

" دھرم میں وہ تمام گردوپیش کے حالات شامل ہوتے ہیں جن کے درمیان خدا نے ہم کورکھا ہے۔ دھرم کا مطلب یہ ہے کہ ہرشخص ان حالات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے اوراپنی بہتری فلاح اوربہبودی کی خاطر ان حالات کے خلاف بغاوت نہ کرے اورنہ ان حدود سے تجاوزکرے"[4]۔

دھرم کی یہ تعریف مسٹرگاندھی کی اپنی نہیں بلکہ ہندوکتُب مقدسہ کی ہے چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں:

" اپنا دھرم ودستورالعمل دوسروں کے پورے اورکامل دھرم سے بہتر ہے خواہ وہ قابلِ تعریف بھی نہ ہو"(۳: ۳۵)۔ " اے ارجن تواپنے دھرم کی طرف نگاہ کرکیونکہ کھشتری کوجنگ کرنے سے ہی نجات حاصل ہوتی ہے اورچھتری کے دھرم کوپورا کرنے سے انکارکرنا ناتمہارے لئے گناہ ہے"(۲:، ۳۱۔ ۳۲)" چھتری شودریش برہمن کے اپنے اپنے گُن اورافعال ہیں۔ برہمن کے کرم شم ، دم ، تپ ، اورعلم وصفائی وغیرہ ہیں۔ چھتری کا کام شجاعت سے جنگ وجدل کرنا ہے۔

[4] Andrews.M.Gandhi's Ideas,p.129

دیش تجارت کھیتی باڑی کا کام کرے اورشودرکا کام خدمت اورتواضع کرنا ہے۔ ہرایک انسان اپنے اپنے دھرم کےکرنے سے درجہ پاتا ہے۔ اوروں کے کامل دھرم سے اپنا خام دھرا بہتر ہے اگرہم اپنی اپنی ذات کاکام کریں گے توکوئی گناہ نہیں ہے اگراپنا کرم بُرا بھی ہوتو بھی اس کوترک کرنا نہایت بُراکام ہے" (۱۸: ۴۱تا ۴۸)۔

اگردھرم کی یہ تعریف درست ہے تویقیناً ہندودھرم اس قابل نہیں کہ کوئی شخص اُس کا حلقہ بگوش رہے۔ کیونکہ جب دھرم پر ایمان رکھنے کا یہ نتیجہ ہوکرانسان اپنے حالاتِ گردوپیش سے بغاوت نہ کرے اوراپنی فلاح کومدِنظر رکھ کر اپنی سطح سے اُوپر نہ اٹھے وہ کس طرح ترقی کرسکتا ہے؟ اندریں حالات ہندی قوم اوربنی نوع انسان کی ترقی کی کیا اُمید ہوسکتی ہے؟

رام کرشن پرم ہمس کا مذہب

دورِحاضرہ میں سری رام کرشن پرم ہمس اورآپ کے شاگرد سوامی ویویکانند نے ان خیالات کو مروج کرنے کی ازحد کوشش کی ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں اوریکساں طورپر خدا کی قربت عطا کرتے ہیں۔ ان دونوں مہاتما پُرشوں کی اعلیٰ زندگیوں نے ہندوستان کی نوجوان پُشت کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ پس متعدد ہندونوجوان اُن کی زندگیوں سے متاثر ہوکران کی تعلیم کوبرحق سمجھنے لگ گئے ہیں۔ رام کرشن خود کالی دیوی کی پوجا کیا کرتے تھے۔ آپ اس کی صورت کے سامنے گھنٹوں بیٹھاکرتے تاوقتیکہ وجد کی حالت میں نہ آجاتے۔ آپ وشنوں کی پوجا بھی کرتے تھے اوررادھا کا لباس پہن کرآپ کرشن کی پوجا کیا کرتے تھے تاکہ آپ میں پریم کا وہی جذبہ پیدا ہوجائے جورادھا کے دل میں تھا۔ سیدنا مسیح کی محبت بھی آپ کے دل میں تھی چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ کسی ہندودوست کے گھر میں بیٹھے تھے دیوارپر بی بی مریم اوربچے کی تصویر آویزاں تھی۔آپ کی نظر میں یہ تصویر زندہ ہوگئی اورکئی دنوں تک آپ بی بی مریم اورسیدنا مسیح کے خیال میں مست اوراُن کی محبت میں محور ہے۔ ایک روز عالمِ بے خودی میں آپ نے ایک متین چہرے اور خوبصورت آنکھوں والے انسان کواپنی طرف آتے دیکھا اورایک آواز سنی جو کہتی تھی کہ" مسیح کودیکھ جس نے دنیا کی خاطر اپنی جان دے دی ہے۔یہ وہی ہے ہے جودنیا کا سب سے بڑا یوگی ہے جوخدا کے ساتھ ایک ہے۔یہ مسیح ہے جومحبت کااوتار ہے" پھر ابن آدم نے ابن کالی (رام کرشن سے معانقہ کیا اوراس کو اپنے اندرجذب کرلیا۔ رام کرشن وجد میں آگے اوربرہما کے ساتھ ایک ہوگئے اوربڑی مدت

کے بعد ہوش میں آئے اوراس تجربہ کی وجہ سے الوہیتِ مسیح کے قائل ہوگئے۔

رام کرشن نہ صرف اپنے دیوتا کرشن سے ہی دعا کرتے تھے بلکہ سیدنا مسیح اورحضرت محمد سے بھی پرارتھنا کیا کرتے تھے۔ اپنے آخری ایام میں آپ نے فرمایا کہ" میں اب اُس منزل کوپہنچ گیاہوں جہاں سے میں یہ دیکھ سکتاہوں کہ دنیا کا ہرفرد بشر خدا کا مظہر ہے اورکہ جس طرح خدا اپنے آپ کو ایک مقدس ہستی میں ظاہر کرتا ہے ۔ اسی طرح اس ایک گنہگار ہستی میں بھی ظہور ہے۔ پس جب میں کسی شخص سے ملاقات کرتاہوں میں اپنے دل میں کہتاہوں کہ فلاں شخص خدا ہے جوایک مقدس ہستی کی شکل میں ہے۔ فلاں شخص خدا ہے جسکا ظہورایک گنہگارکی صورت میں ہوا ہے"۔

یہ صحیح اورمنطقی نتیجہ ہے تمام مذاہب کویکساں ماننے کا۔ اس منزل پرنیکی اوربدی۔ راستی اورناراستی ۔جھوٹ اورسچ محبت اورعداوت پاکیزگی اورپلیدگی بے معنی الفاظ ہوجاتے ہیں۔ اگرخدا کا ظہورتقدس اورناپاکی دونوں میں ہے توان الفاظ کے کوئی حقیقی معنی نہیں رہتے اورنہ ان میں قطعی طورپر تمیز ہوسکتی ہے اورنہ ایسا خدا ہماری پرستش کے قابل ہوسکتاہے۔ چنانچہ رام کرشن کہتے ہیں:

"خدا چورکوکہتاہے کہ جوچوری کر اورگھر کے مالک کو کہتاہے کہ خبردار

Mozamdar, Parinahansa Rama Kirshna, p.103

آپ کے شاگرد رشید سوامی دیویکانند کہتے ہیں کہ:

"گناہ محض ایک دھوکا طلسم اورمایاہے جس کی درحقیقت کوئی ہستی نہیں۔ کسی انسان کو گنہگار کہنا سب سے بڑا گناہ ہے[5]۔

ایسا عقیدہ اخلاق کی جڑوں کوکھوکھلا کردیتا ہے لیکن جب ہم یہ مان لیں کہ خدا غیرمشخص ہے توتمام اخلاقی امتیازات رُخصت ہوجاتے ہیں ۔لیکن چونکہ نیکی ، پاکیزگی ، راستی ، حق اورمحبت ازلی اوراٹل حقیقتیں اوراُصول ہیں لہذا کوئی ایسا نظریہ قبول نہیں کیا جاسکتا ہے جس کا نتیجہ ان اخلاقی اُصولوں کے خلاف ہو۔پس ہم یہ نہیں مان سکتے کہ تمام مذاہب یکساں طورپر برحق ہیں۔

گاندھی جی کا مذہب

چونکہ گاندھی جی کی شخصیت ہمارے وطن میں نہایت بارسوخ اورپُراثر ہے لہذا ہم ان خیالات کو شرح اوربسط کے ساتھ ناظرین

[5] World Parliament of Religious, 2.p.97

کے روُبروپیش کرتے ہیں:اُن کے اقتباسات ان کی تحریرات سے لئے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

" میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں ایک ایماندار شخص اورمردِ دعا ہوں اوراگرمیرے ٹکڑے ٹکڑے بھی کردئیے جائیں مجھے یقین ہے کہ خدا مجھے طاقت بخشے گا کہ میں اس کاانکارنہ کروں بلکہ اس کی ہستی کا اقرارکروں۔ مسلمان کہتے ہیں لا آلہ الا اللہ۔ مسیحی بھی یہی کہتے ہیں اورہندوبھی یہی مانتے ہیں۔ بُدھ مت کے پیرودوسرے الفاظ میں یہی اقرارکرتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف ادیان میں لفظ" خدا " کے تصورات جُدا جُدا ہیں اورگوہم ایک ہی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ تاہم مختلف لوگوں کے لئے اس لفظ کا مفہوم مختلف ہے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ ہم جوخدا کے سامنے رینگنے والی مخلوق ہیں اوراس کی لامحدود عظمت محبت اوررحم کوکس طرح جان سکتے ہیں۔۔۔یہ لازم نہیں ہے کہ ہم اپنی تقریروں اورتحریروں سے دوسرے لوگوں کو اپنے دین میں داخل کریں۔۔۔ اگرمیرے مشنری دوست اس بات کو قبول کرلیں تومذہبی معاملات میں بغض، حسد ،رقابت ، شکوک اورتفرقوں کی گنجائش ہی نہ رہے گی بلکہ ہر جگہ صُلح اورامن کا دورہ ہوگا۔۔۔۔ مشنریوں کا یہ کام نہیں کہ مشرقی لوگوں کی زندگیوں کو جڑسے اکھاڑپھینکیں ۔۔۔۔وہ ہم کو ہماری حالت پر چھوڑدیں"۔

میں نے بائبل کو مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اورمیں اس کو اپنی عبادتی کتُب کاایک حصہ سمجھتاہوں۔ پہاڑی وعظ کی رُوح نے میرے دل کوقریب اُسی طرح موہ لیاہے جس طرح بھاگوت گیتا نے۔ میں یہ دعویٰ کرتاہوں کہ میں کسی مسیحی سے پیچھے نہیں ہوں۔ جب میں یہ مسیحی گیت گاتاہوں کہ" اے مسیح کے نور، توشبِ دیجورکوروشن کراورمیری راہنمائی کر"۔

"پہاڑی وعظ میں مسیح کا پیغام صاف اورخالص ہے۔ وہ بغیر کسی آمیزش کے اُس میں مکمل طورپر موجود ہے۔

حق تویہ ہے کہ انجیل نے ہی مجھ کو ستیاہ گراہ کی قدر اوروقعت سکھلائی اوربتلایا کہ یہی راہ اورطریقہ راست درست اورصحیح ہے"۔

"میرے نزدیک مسیح دنیا کے عظیم الشان معلموں میں سے ایک ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں کے لئے خدا کااکلوتا بیٹا تھا لیکن یہ ضرورنہیں کہ میں اس عقیدہ کےساتھ اتفاق کروں میں یہ مانتاہوں کہ خدا کے اکلوتے بیٹے بہت ہیں لیکن اس کے

باوجود مسیح نے میری زندگی کومتاثر کررکھا ہے۔ میں لفظ" اکلوتے" کو اُس کے لفظی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ میرے خیال میں اس لفظ کا مطلب زیادہ گہرا ہے کیونکہ اس لفظ سے میری مُراد " روحانی پیدائش" ہے۔ سیدنا مسیح اپنے زمانے کے لوگوں میں سب سے زیادہ خدا کے قریب تھے۔ آپ نے اُن لوگوں کے گناہوں کی خاطر جوآپ کی تعلیم کومانتے تھے اپنے کامل نمونہ سے فدیہ دیا لیکن آپ کاکامل نمونہ اُن لوگوں کے لئے کسی کام نہ تھا۔ جواپنی زندگیوں کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جس طرح صاف کیا ہوا سونا اپنی میل کوچھوڑدیتا ہے اسی طرح جوشخص نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے اپنی بُرائی کوترک کردیتا ہے"(چرچ آف انگلینڈ نیوزپیپر۱۰مارچ ۱۹۳۹ء)۔

"میں مسیحیت میں بہت سی باتوں کا مداح ہوں لیکن میں تم سے یہ کہتاہوں کہ جس صورت میں ہندومذہب کا میں قائل ہوں اُس سے میری روح کوپوری تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اُپنشدوں اوربھاگوت گیتا سے مجھ کو وہ تسلی ملتی ہے جوپہاڑی وعظ سے بھی نہیں ملتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پہاڑی وعظ کے نصب العین کے میرے دل میں جگہ کرلی ہے لیکن نااُمیدی ،یاس، شک اورروحانی تاریکی کے ایام میں بھاگوگ گیتا سے ہی مجھے شانتی ملتی ہے۔ جب میں اُسکی ایک آیت پڑھتاہوں توغم کے بادل دورہوجاتے ہیں ۔ میری زندگی الم ناک داستانوں سے پُر ہے لیکن بھاگوت گیتا کی تعلیم کی وجہ سے غم اوررنج کا اثرمجھ پر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ میں نے بائبل مقدس کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے قرآن کودیکھا ہے اوریہودیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔میں نے زرتشت کے مذہب کا بھی مطالعہ کیا ہے اورمیں بالآخر اس نتیجہ پر پہنچاہوں کہ تمام مذاہب حق پر ہیں اوران میں سے ہرایک مذہب غیرمکمل ہے"۔

" میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتاہوں کیونکہ میرا ایمان ویدوں اُپنشدوں ، پرانوں اوردیگر تمام ہندوکتابوں پر ہے۔ میں اوتاروں کا قائل ہوں اورآواگون کومانتاہوں۔ (۲) میں ورن آشرم دھرم(ذات پات) کا قائل ہوں اورمیرا ایمان ہے کہ یہ ویدوں کی تعلیم ہے۔ (۳)میں گورکھشا کا قائل ہوں اور(۴) میں بُت پرستی کوماننے کے خلاف نہیں ہوں۔

" جب میں بزعم خودبسترمرگ پرتھا توگیتا ہی میری تسلی کا موجب تھی"ہندومذہب میں تمام دنیا کے انبیا کی پرستش کے لئے جگہ ہے"۔اگرمجھے قرآن اوربائبل کی تاویل کرنے کی اجازت ہو تومیں ان کو اپنی تاویل کے مطابق مان کراپنے آپ کو مسلمان یا مسیحی کہہ

سکتاہوں کیونکہ میرے لئے الفاظ "ہندو"، مسلمان اور"مسیحی" متراف الفظ ہونگے۔

بے دلی اس بے وفا کی مہربانی پر نہ بھول
دل کادشمن ہے اگرکرتاہے ہے باتیں پیار کی

مسیحیت کی نسبت گاندھی جی کہتے ہیں:

میرے لئے اس بات پر ایمان لاناممکن ہے کہ میں صرف مسیحی ہوکرہی نجات حاصل کرسکتاہوں میں یہ نہیں مان سکتا کہ یسوع ہی اکیلا مجسم اوتاراورابن اللہ ہے اورصرف وہی لوگ ابدی زندگی حاصل کرسکتے ہیں جوآپ پر ایمان لاتے ہیں ۔ اگرانسان کے لئے خدا کا بیٹا ہوناممکن ہے توکل انسان خدا کے بیٹے ہیں۔ اگریسوع خدا کی مانند تھے یا خدا تھے توتمام انسان خدا کی مانند ہیں اورخدا ہوسکتے ہیں۔میری عقل اس بات کو قبول نہیں کرسکتی کہ یسوع کی موت اورخون سے دنیا کے گناہ دورہوسکتے ہیں۔ ہاں تمثیلی پیرایہ میں یہ بات ہوسکتی ہے۔ ۔۔۔۔ میں یسوع کوایک شہید کے طورپر مان سکتاہوں ۔ آپ سراسر ایثار مجسم تھے۔ اورخدا کی طرف سے ایک استاد تھے لیکن آپ کامل اوراکمل ہستی نہ تھے ۔ آپ کی صلیبی موت دنیا کے لئے ایک زبردست نمونہ ہے۔۔۔۔ یہ ناممکن ہے کہ میں مسیحیت کوتمام مذاہب سے اعلیٰ اورافضل یاایک کامل مذہب مان لوں"۔

"سالہسال سے میں اس بات کو مانتاچلا آیاہوں کہ یسوع ناصری دنیا کے عظیم الشان استادوں میں سے ایک اُستاد تھے۔میں جانتاہوں کہ مسیحی آپ کو اس سے کہیں بڑا رتبہ دیتے ہیں لیکن میں جوایک غیر مسیحی ہوں اورہندوہوں آپ کو اس سے زیادہ نہیں مانتاکہ ان ہندوؤں سے جو اس کالج میں تعلیم پارہے ہیں یہ کہتاہوں کہ جب تک تم یسوع ناصری کی تعلیم کا انکساری کے ساتھ مطالعہ نہیں کروگے تمہاری زندگیاں غیرمکمل رہیں گی۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ جوشخص خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو۔ دیگرمذاہب کا مطالعہ انکساری کے ساتھ کرتا ہے وہ اپنے ذہن کو وسیع کرتا ہے میرا یہ خیال ہے کہ دنیا کے بڑے مذاہب میں سے کوئی مذہب بھی باطل نہیں ہے۔ تمام مذاہب نے بنی نوع انسان کوبہتربنادیا ہے اوراب بھی وہ اپنا مطلب پورا کررہے ہیں۔۔۔۔۔ ہر شخص کا مذہب اس کے اوراس کے خالق کے باہمی تعلق کا نام ہے۔۔۔۔ بعض خدا کورام بلاتے ہیں۔ بعض اسی کو کرشن کے نام سے پکارتے ہیں اوربعض اس کو اللہ کہتے ہیں ۔ تمام انسان ایک ہی روح کی پرستش کرتے ہیں"۔

یسوع کا مکاشفہ ایک روشن مکاشفہ ہے ۔لیکن وہ بے عدیل مکاشفہ نہیں ہے۔ یسوع مسیح اکیلا تخت نشین اورواحد تاجدار نہیں کیونکہ میرا یہ ایمان ہے کہ خدا باربارمجسم ہوا ہے۔

مرحوم مسٹراینڈروز لکھتے ہیں کہ:

جب کبھی میں سبرمتی آشرم میں جاتا تھا توگاندھی جی کا یہ قاعدہ تھاکہ عبادت کے اختتام سے پہلے مجھ سے مسیحی گیت گانے کی فرمائش کیا کرتے تھے ان گیتوں کے مطلع جن کو وہ پسند کرتے تھے حسب ذیل ہیں:

۱۔ الہٰی نور۔ کرروشن یہ دیجور۔ توربہرہو"۔

۲۔ صلیب پر جب میں کرتا دھیان ۔ جس پر موُاشاہِ ذوالجلال"۔

۳۔تجھ پاس خداوند۔ تجھ پاس خدا"۔

۴۔یسوع توہے میری آس۔ آتاہوں میں تیرے پاس"۔

۵۔رہ میرے ساتھ ۔ جلد ہوا چاہتی ہے شام"۔

" میں اس بات کا قائل نہیں کہ ویدوں کے علاوہ کوئی اورکتاب الہامی نہیں ہے۔ میں بائبل ، قرآن ، ژندواستا کوویدوں کے برابرالہامی مانتاہوں ۔ میں اس بات کوضروری نہیں سمجھتا کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے ایک ایک لفظ اورایک ایک آیت کو الہامی مانا جائے۔میں ان کتابوں کی کوئی ایسی تفسیر ماننے کو تیار نہیں ہوں جوعقل اوراخلاق کے خلاف ہوخواہ وہ مفسر کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو[6]۔

مسٹرگاندھی کے خیالات کی مفصل تنقیح وتنقید ہم انشااللہ اس رسالہ کے آئندہ ابواب میں کرینگے۔ یہاں ہم کو صرف یہ دکھلانا کہ مسٹرگاندھی تمام مذاہب کویکساں طورپر صحیح مانتے ہیں اوریہاں ہم اس نظریہ کے حسن وقبح پر بحث کرنے پر اکتفا کرینگے"۔

۱

یہ بات حق ہے کہ مختلف مذاہب میں صداقت کے عناصر پائےجاتے ہیں ۔ ہم اپنے رسالہ" مسیحیت کی عالمگیری" کے باب دوم میں یہ ثابت کرآئے ہیں کہ ہرایک مذہب میں صداقت کی جھلک پائی جاتی ہے اورکوئی مذہب ایسا نہیں جوالف سے لے کری تک باطل اورشیطانی ہو۔ انجیل جلیل اورمسیحی کلیسیا کی یہ تعلیم ہے کہ:

---

[6] Andrews, M.Ghandi's Ideas,p.73-74

جس طرح آفتاب عالمتاب کے نور سے چاند اورسیارے چمکتے ہیں اُسی طرح مسیح کلمتہ اللہ کے نُورسے جوآفتابِ صداقت ہے کل اقوام وممالک فیض یاب ہوئے ہیں"(یوحنا۱: ۱تا ۳ وغیرہ)۔

لیکن جس طرح

"آفتاب کا جلال اورہے اورمہاتاب کا جلال اورہے اورستاروں کا جلال اورہے کیونکہ ستارے ستارے کے جلال میں فرق ہے"(۱کرنتھی۱۵: ۴۱)۔

اسی طرح مسیحیت کا جلال اورہے اسلام کا جلال اورہے۔ ہندومذہب کا جلال اورہے۔ بلکہ ہندومذہب کے فرقوں کے جلال میں بھی فرق ہے۔ لیکن چونکہ سب مذاہب میں صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتاکہ تمام مذاہب یکساں طورپر برحق ہیں اوراُن میں کسی قسم کافرق نہیں"۔

دنیا میں کوئی اخلاقی مذہب ایسا نہیں جو کلیتہً باطل ہواورجس میں گھٹاٹوپ تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی ہو۔ ہرایک مذہب میں جو اخلاقی اُصول کے خلاف نہیں کسی حد تک نورصداقت کی جھلک نظر آتی ہے۔خدا نے کسی شخص اورقوم اورملک کوبغیرگواہ کے نہیں چھوا۔ ہرشخص کے دل میں کم ازکم اس کے ضمیر کی روشنی موجود ہوتی ہے خواہ وہ روشنی کیسی ہی مدھم کیوں نہ ہو۔ دنیا کے مختلف مذاہب آفتابِ صداقت کی شعاعوں سے کم وبیش منورہیں۔ اس واضح حقیقت کوآبائے کلیسیا نے یوں ظاہر کیاہے کہ کلمتہ اللہ جوازل سے موجو دہے" حقیقی نورہے جوہرایک آدمی کوروشن کرتا ہے "۔ وہ ابتداء میں تھااورابتدا ہی سے اس کا نورتاریکی میں چمکتا رہا ہے اوراسی نورکے پرتو کی وجہ سے دنیا کے مختلف مذاہب میں صداقت کاعنصر پایا جاتا ہے کیونکہ" اس کلمتہ اللہ کی معموری میں سے ہم سب نے پایا"(یوحنا۱: ۴) یہ تمام مذاہب آفتاب صداقت یعنی سیدنا مسیح کے پیش خیمہ ہیں اور مسیح تک پہنچانے کو ہمارے استاد بنے"(گلتیوں ۳: ۲۴) دنیا کے تمام دیگرمذاہب یہ ظاہرکرتے ہیں کہ گنہگارانسان کی سرشت میں یہ خواہش موجود ہے کہ اس کا کسی نہ کسی طریقہ سے خدا کے ساتھ میل ملاپ ہوجائے لیکن یہ ملاپ صرف اس محبت کے ذریعہ ہوسکتا ہے جوخدا باپ اپنے بچوں کے ساتھ رکھتا ہے اورجس کا کامل مکاشفہ انجیل جلیل میں موجود ہے۔ منجئی کونین نے اپنی تعلیم ۔ زندگی اورموت کے وسیلے اس محبت کوکامل اوراکمل طورپر ظاہر فرمایا ۔ مختلف مذاہب میں صداقت کا عنصرپایاجاتاہے اور

اس عنصر کی روشنی ان مذاہب کے پیروؤں کو ابن اللہ کے قدموں تک لانے کا کام سرانجام دیتی ہے۔ یہ صداقت کا عنصر ظاہر کرتا ہے کہ منجئی عالمین کل اقوامِ عالم کے ادیان کا مطمح نظر اورنصب العین ہیں۔

اس بات کوہم ایک مثال سے واضح کردیتے ہیں۔لڑکا جب سکول جاتا ہے توالف، ب، اورقاعدہ پڑھتا ہے۔ اس کے بعد ابتدائی کتابیں پڑھتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ مبتدی سے منتہی بن جاتا ہے۔ اسی طرح ادیانِ عالم ابتدائی مدارج کے مذاہب ہیں اور انتہائی درجہ مسیحیت کا ہے۔ جس طرح قاعدہ میں علم کی شعاع کاپرتو موجود ہے اسی طرح ابتدائی منازل کے مُشرکانہ مذاہب میں آفتابِ صداقت کے نورکا پرتو موجود ہے جس طرح طالب علم رفتہ رفتہ ترقی کرکے علم کے ابتدائی منازل کوطے کرتا ہے اوراُس میں علم کا نور بڑھتا جاتا ہے اسی جُوں جُوں ہم ابتدائی مدارج کے مذاہب کوپیچھے چھوڑتے جاتے ہیں صداقت کا عنصر بڑھتا اورترقی پذیر ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ مسیحیت میں آفتابِ صداقت درخشاں ہوکرچمکتا ہے۔

لیکن کوئی صاحبِ ہوش یہ نہیں کہیگا کہ چونکہ قاعدہ اورابتدائی مدارج کی کتب میں بھی علم موجود ہے اورانتہائی درجہ کی کتب میں بھی علم موجود ہے لہذا تمام مدارج کی کتابوں میں یکساں طورپر علم پایا جاتا ہے ۔ اسی طرح کوئی صحیح العقل شخ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ ابتدائی مدارج کے مذاہب میں بھی صداقت پائی جاتی ہے اورانتہائی مذہب میں بھی صداقت پائی جاتی ہے لہذآ تمام مذاہب یکساں طورپر صحیح اوردُرست راست اورحق ہیں ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ صرف۔ سیدنا مسیح کی انجیل ہی انتہائی مذہب ہے جوعالمگیر ہے اورتمام ممالک اوراقوام وازمنہ کے افراد کے لئے برحق ہے۔

آفتابِ آمد ، دلیل آفتاب
گرلیلت باید۔ ازروئے رُومتاب

ہم جوہندوستان کے مسیحی ہیں اس خیال سے خوش ہوئے بغیرنہیں رہ سکتے کہ سیدنا مسیح وہ" حقیقی نور" ہے جوہرایک آدمی کو روشن کرتا ہے"(یوحنا ۱: ۵)۔ اوراس نور کی کرنیں ہم کو ہمارے وطن عزیز کے مذاہب میں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم کو اس خیال سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ جس طرح "پرانا عہدنامہ" اہل یہود کومسیح تک لایا اوروہ نئے عہد نامہ میں داخل ہوگئے یاجس طرح فلسفہ یونانیوں کومسیح تک لایا اوروہ " حقیقی معرفت" سے بہرہ یاب ہوگئے اُسی طرح "حقیقی نور" کی شعائیں وید اوراُپنشدوغیرہ کی شکل

میں ہمارے آباد واجداد کے سینوں میں چمکیں اورہم کو جواُن کی اولاد ہیں یہ موقعہ دیتی ہیں کہ ہم بھی سیدنا مسیح کے پاس جائیں۔اوراگرہم تعصب کی وجہ سے ہندوکتب مقدسہ کواپنی روحانی خوراک کے لئے کافی سمجھتے ہیں تو ویدوں اوراپُنشدوں اورگیتا کی بے عزتی اوربے حُرمتی کرتے ہیں کیونکہ ہم اُن کی اصل غرض اورعلتِ غائی کو پورا ہونے سے روکتے ہیں۔ وہ ابتدائی مراحل کی کتابیں ہیں اوراس ان کے وجود کا اصلی مقصد انجیل کی انتہائی کتب کی طرف لے جاناہے ۔ جس طرح اُردو قاعدہ کا مقصد تب ہی پورا ہوتا ہے جب ہم ابتدائی کتابیں پڑھنی شروع کریں اورابتدائی کتب کا مقصد تب پورا ہوتاہے جب ہم علم کے بحر میں غوطے لگائیں اوراگرایسا کرنے سے ہم پرہیز کریں توان کی اصلی غرض اورعلتِ غائی فوت ہوجاتی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں انسانی کوششوں کا نتیجہ ہیں لہذا وہ صرف ایک خالص بلندی تک ہی پرواز کرسکتی ہیں۔ ان کتابوں کی انتہائی بلندیاں مسیحیت کی ابتدائی منازل ہیں۔ وید، اُپنشد اوربھاگوت گیتا ہم کو مسیح تک لاتی ہے تاکہ ہم اس کو اپنا منجئی مان کرحقیقی الہٰی معرفت اوررفاقت حاصل کرسکیں۔

۲

لیکن مسٹرگاندھی اس قسم کے طریقہ کار کے جانی دشمن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب مختلف اقوام کی ضروریات کو مختلف طریقوں سے پورا کرتے ہیں پس ہمیں تحقیق مذاہب کی بحث میں نہیں الجھنا چاہیئے بقول شخصے

نگہ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

جس کو جومذہب پسند آئے وہی اس کے لئے اچھا ہے۔ بظاہر یہ درست ہے کہ مختلف مذاہب مختلف اقوام کی ضروریات کومختلف طریقوں سے پورا کرتے آئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتاکہ کوئی مذہب قطعی اورختمی طورپر عالمگیر نہیں ہوسکتا اورنہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ عالمگیر مذہب کُل اقوام عالم کی روحانی اقتضاؤں کوبدرجہ احسن پورانہیں کرسکتا۔

یہ ظاہر ہے کہ اگرکوئی مذہب قطعی اورختمی طورپر صحیح اورراست اور عالمگیر نہیں توتمام مذاہب یکساں طورپر باطل ہونگے۔ کیونکہ ان کی صداقتیں ایسی نہیں ہونگی جودیگرممالک واقوام وازمنہ پر حاوی ہوسکیں اوریہ صرف اس حالت میں ہوسکتا ہے جب ان کے اُصول باطل ہونگے پس اگرہم یہ مانیں کہ تمام مذاہب

یکساں طورپر صحیح ہیں توہمیں لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ یکساں طورپرباطل بھی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے انسان پر کوئی مکاشفہ ظاہر نہیں کیاجوکامل اوراکمل ہو اورجوہرملک وقوم کے ہرفرد بشر کی انسانی سرشت کی اقتضاؤں کو پورا کرسکے۔ اوریہ ایک ایسا نتیجہ ہے جوخدا کی ذات وصفات پر دھبہ لگاتا ہے لہذا ہم اس قسم کے نتیجہ کو قبول نہیں کرسکتے ۔ پس خدا نے ایک کامل مکاشفہ ہم پرظاہر کیا ہے اورہرذی عقل شخص کاکام ہے کہ وہ اس عالمگیر مکاشفہ کو معلوم کرے۔ تاریخ عالم اس بات کی گواہ ہے کہ مسیحیت مختلف اقوام وممالک وازمنہ کےلوگوں کی مختلف ضروریات کوبدرجہ غایت پوری کرتی رہی ہے۔ پس اس چٹان جیسی حقیقت پر اس قسم کی بوی دلیل کی کشتی پاش ہوجاتی ہے۔

مذہبی اختلافات کی حقیقت

مسٹرگاندھی کہنے کوتو کہہ گئے کہ مختلف مذاہب کے بعض مسائل غیر ضروری اورعارضی ہیں لیکن اُنہوں نے کوئی معیار قائم نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہوسکے فلاں قسم کے مسائل اہم اوربنیادی ہیں اورفلاں قسم کے مسائل سطحی ہیں۔اُنہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اختلافی مسائل کو عارضی اورغیر ضروری قراردے کر فروعات میں شامل کردیا۔ لیکن کیا عقل اس بات کو تسلیم کرسکتی ہے کہ مذاہب عالم کے اختلافات درحقیقت فروعی اختلافات ہیں اورمذاہب عالم میں دراصل کوئی فرق نہیں ؟ جس کسی نے بنظرتعمق مذاہب کا مطالعہ کیا ہے وہ اس قسم کے خیال کومضحکہ خیز تصورکرے گا ۔ مسٹرگاندھی کا مخالفانہ رویہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ مذہبی اختلافات محض سطحی نہیں بلکہ مختلف مذاہب کے اختلافات بنیادی اختلافات ہیں۔

۲

ہمیں یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیےکہ کسی مذہب کی خصوصیات اُن عقائد پر منحصر نہیں جودیگر ادیانِ عالم کے ساتھ مشترکہ طورپر رکھتا ہے بلکہ ہرمذہب کی خصوصیت اس کے امتیازی اُصول میں موجود ہوتی ہے۔ جس شخص نے اصول منطق کی روشنی میں مختلف مذاہب کا سطحی مقابلہ بھی کیا ہے وہ کہنے کی جرات نہیں کرسکتا کہ مختلف مذاہب کے جوامتیازی اُصول ہیں وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ کیونکہ ان کا امتیازی نشان خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اہم ہیں اوردوسرں سے مختلف الگ اورجدا ہونے

کی وجہ سے وہ بنیادی ہیں۔ اورکوئی عقلمند شخص امتیازی اصولوں کونظر اندازنہیں کرسکتا۔

بفرض محال اگریہ مان بھی لیا جائے کہ اختلافی مسائل عارضی اورغیر ضروری اورفروعی قسم کے ہیں توکیا اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ وہ اربابِ فکر کی توجہ کے قابل نہیں ہوتے؟ کیا کوئی صحیح العقل شخص کہہ سکتا ہے کہ جومسائل ہندومت اوراسلام اورمسیحیت میں تمیزاورفرق کا باعث ہیں وہ ایسے ہیں جوغوروفکر کے قابل ہی نہیں اوران پرتوجہ دینا وقتِ عزیزکو رائیگاں کرنا ہے؟ اس قسم کی خرافات کا وہی مرتکب ہوسکتا ہے جوعقل اورمذہب دونوں سے ناآشنا ہے۔

۳

سچ پوچھوتواختلافات کونظر اندازکرنے سے مذہبی رواداری کی بنیاد نہیں پڑسکتی۔ ہاں ظاہرداری اوریاکاری کی بنیاد پڑسکتی ہے اور یہ امورحقیقی اتحاد کے حق میں سم قاتل کا کام دیتے ہیں۔ کیونکہ خفت کی فضا میں مصالحت دوستی اوریگانگت نشوونما نہیں پاسکتے۔ ہاں نفاق کوترقی ہوگی کیونکہ اگرمختلف مذاہب کے پیرو اپنے اختلافی مسائل کا ذکرنہ کرینگے توان کی زبانیں اُن کے دلی جذبات کی ترجمان نہ ہونگی حق کو چھپانے اورراستی پرپردہ ڈالنے سے ہندی قوم کی فلاح اوربہبودی نہیں ہوسکتی۔ مسٹرگاندھی خودفرماتے ہیں کہ:

"عدم تشدد کا یہ مطلب نہیں کہ ہم حق کو اپنے آپ سے یادنیا سے چھپائیں"(ہریجن ۳ فروری ۱۹۴۰ء)۔

مشترکہ عقائد کو بیان کرنے اوراختلافی مسائل کوچھپانے میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ فریق ثانی کو یہ خیال ہوجاتا ہے کہ فریقین میں درحقیقت کوئی فرق نہیں۔ اوریوں فریق ثانی کواُلو بنایا جاتا ہے۔ اوروہ غریب اس خیال میں ہوتا ہے کہ تمام دنیا اس کی ہم خیال ہے لیکن ہر صحیح العقل شخص کو اس قسم کی ابلہ فریبی اورخود فریبی کی زہریلی فضا سے نکلنا چاہیے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ اُن اصحاب کے عقائد کی جواس سے اختلاف رائے رکھتے ہیں جانچ پڑتال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگاکہ اس کے اپنے عقائد کی بھی ساتھ ہی تائید یاتردید ہوجائیگی۔لیکن اگرخفا کا پردہ فریقین کے خیالات میں حائل ہوگا تو منافقانہ رویہ کی ترقی ہوگی اورکوئی قوم نفاق کی بنیاد پر شاہراہ ترقی پرگامزن نہیں ہوسکتی۔

ہم دلی ازہم زبانی بہتر است (مولانا روم)

۴

مصنوعی رواداری کے حامی کہتے ہیں کہ دینی اُمور میں فقط اُن عقائد کاذکر کرنا چاہیے جوتمام مذاہب میں مشترک ہیں۔لیکن کیایہ بات سچ ہے کہ تمام مذاہب میں ایک ایسا عنصر ہے جوگویا ان کا واضعاف اقل ہے جب ہم ادیانِ عالم کا مقابلہ کرتے ہیں توہم کوکوئی ایسی بات نہیں ملتی جوتمام ادیان میں مشترکہ طورپر موجود ہو۔ مثلاًا فریقہ کی مُردم خواراقوام کے مذاہب یاخودہندوستان کے اصلی باشندوں کے مذاہب یادیگر جاہل وحشی جنگلی اورپست اقوام کے مذاہب ۔ہندو مت ، بدھ مت، کنفوشیس مت، شنٹومت، یہودیت ، زرتشت مت ، اسلام اورمسیحیت وغیرہ کیا شراکت اورمناسبت ہے؟

ان سب میں کیا شے ہے جوان تمام مذاہب میں موجود ہے اورجس کی موجودگی کی وجہ سے یہ تمام مذاہب یکساں طورپر حق اورراست سمجھے جاتے ہیں۔؟ سچ تویہ ہے کہ جوشخص مختلف اقسام کے مذاہب سے سطحی واقفیت بھی رکھتاہے وہ ان میں سے بعض پر"مذہب" کے لفظ کا اطلاق کرنے سے بھی ہچکچائےگا۔ چہ جائیکہ وہ ان تمام مذاہب کو یکساں طورپر صحیح اوربرحق تسلیم کرلے۔ چونکہ مذاہب عالم میں کوئی حقیقت ایسی نہیں جوتمام مذاہب میں پائی جائے پس اگرہم مبلغین رواداری کے قضایا کومان لیں توہم کو لازمی طورپر یہ ماننا پڑاکہ حقیقی دیندار وہ شخص ہے جوکسی شے پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ حق تویہ ہے کہ ایسے اشخاص مذہب کو ایک نہایت فرومایہ اورہیچ شے خیال کرتے ہیں۔ پس کیا دینی وعلم وعمل کی کم مائیگی مذاہب عالم کے اتحاد کی بنیاد ہوسکتی ہے؟

بفرضِ محال اگرہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ تمام مذاہب میں ایک عنصر ہے جوادیانِ عالم میں مشترک ہے توا سکی مثال ایسی ہوگی جس طرح کل انسانوں کے جسم کا ڈھانچہ ایک ہی قسم کا ہوتاہے۔ لیکن محض ڈھانچہ کی بناء پر کوئی صحیح العقل شخص یہ نہیں کہیگا کہ دنیا بھر کے انسان یکساں طورپر عاقل، مالداروغیرہ ہیں اوران میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۵

کیا یہ بات درست ہے کہ تمام بڑے مذاہب خدا کو مانتے ہیں، مسیحیت کی مانند خدا کی اُبوت اورانسانی اُخوت ومساوات کی تعلیم دیتے ہیں۔ مسٹرگاندھی مانتے ہیں کہ بدھ مذہب دنیا کے بڑے

مذاہب میں سے ہے۔لیکن وہ نہ خدا کا قائل ہے نہ مکاشفہ کا۔ اورنہ اس کی تعلیم کسی الہامی کتاب میں درج ہے۔ اسلام خدا کو بنی نوع انسان کا باپ نہیں مانتا اورنہ ابوت الہٰی کی تعلیم قرآن میں ملتی ہے۔ قرآن تواخوت انسانی کا بھائی قائل نہیں ۔ ہاں اُخوت اسلامی کا قائل ہے۔ اورکیا ہندومت خودکسی قسم کی اخوت یاخدا کی ابوت کومانتا ہے؟ پس ظاہر ہے کہ ہم کسی حالت میں بھی تمام مذاہب کویکساں طورپر صحیح اورحق نہیں مان سکتے۔

۶

مسٹرگاندھی خود کہتے ہیں کہ" میں ہندوکتبِ مقدسہ کی کوئی ایسی بات ماننے کو تیارنہیں جوعقل اوراخلاق کے منافی ہو" ۔ پس ان الفاظ سے اُنہوں نے خودایک قیدلگادی اورصداقت اوربطالت کا ایک معیارقائم کردیا۔ اگرمسٹرگاندھی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس معیار سے ہندومذہب کی کتب مقدسہ کی جانچ پڑتال کریں توہرشخص کویہ حق حاصل ہے کہ اسی معیارسے وہ مختلف مذاہب کی جانچ پڑتال کرکے کھوٹے کوکھرے سے جدا کردے۔ لیکن مسٹرگاندھی دوسروں سے یہ حق چھین کرآمرانہ طورپرتمام مذاہب عالم کویکساں قراردیتے ہیں۔

ہندومت کے مرکب مذاہب

اہل ہنود کا یہ خیال ہے کہ حق اورصداقت ایک سمندرکی طرح ہے جس میں چاروں طرف سے مختلف دریاؤں کے پانی گرتے ہیں اوراس کو زیادہ گہراکردیتے ہیں ۔ چنانچہ زمانہ حال کے تعلیم یافتہ ہندوؤں کا نبی سری ارابند وکہتا ہے" ہرمذہب نے نوع انسان کو فائدہ پہنچایا ہے، چنانچہ بُت پرست مذاہب نے بُت تراشی سے اوراپنی مذہبی رسوم سے انسان میں خوبصورتی کی حس بڑھائی ہے۔ مسیحیت نے الہٰی محبت اورانسانی اُخوت کا سبق دیا ہے، بدھ مت نے پاکیزگی ، ملائمت اوررحمدلی کی تلقین کی ہے، یہودیت اوراسلام نے دینی وفاداری اورمذہبی غیرت کا سبق سکھلایا ہے، اوریہ تمام مذاہب ایک مذہب میں ملادئیے جائیں توایک کارِعظیم سرانجام پاجائے" ۔

ہم ذکرکرچکے ہیں کہ ہندومت میں مختلف اورمتضاد عقائد بدوبوش رہتے ہیں، ان کی فلسفیانہ پیچیدگیوں اورمنتطقیانہ نتائج غوروفکرنہیں کیا جاتا ، تمام مذاہب کو درست سمجھاجاتا ہے ۔ پس ہمارے ملک میں مختلف زمانوں میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مختلف مذاہب کے اچھے اصولوں کولے کر ایک نیامرکب مذہب

جاری کیا جائے تاکہ مذاہبِ جنگ کا خاتمہ ہوجائے، چنانچہ اکبر بادشاہ نے "دین الہٰی" جاری کیا تھا جس میں اُس نے اسلام ہندومت اورمسیحیت کے اصولوں کویکجا کیا تھا، لیکن یہ دین چند روز رہا اوراکبر کی موت کے ساتھ ہی اُس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

۲

۱۸۲۸ء میں مرحوم راجہ رام موہن نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی اس نے ویدانت ، اپنشدوں ، قرآن اورانجیل میں سے ان اصولوں کو یکجا کردیا جواس کوبھلے نظر آئے۔ وہ ایک عالم شخص تھا جس نے قرآن عربی میں اورانجیل جلیل کا یونانی زبانی میں مطالعہ کیا تھا۔ اس نے ویدوں کا اوراُپنشدوں کا سنسکرت سے بنگالی زبان میں ترجمہ کیا۔ فارسی میں ایک کتاب" تحفتہ الموحدین" لکھی جومُورتی پُوجا کے خلاف تھی۔ایک اورکتاب" نصائح مسیح" لکھ کر اپنے ابنائے وطن کو انجیل جلیل کی تعلیم سے واقف کرایا۔ اس بے نظیر شخص نے پچپن سال کی عمر میں برہمو سماج کی بنیاد ڈالی جس کااصول یہ تھاکہ تمام موحد بانیانِ مذاہب کی عزت اورقدر کی جائے اوران کی تعلیمات کوبنظرِ وقعت دیکھا جائے۔ ہندومت کی اصلاح کی جائے اورجس مذہب میں جوتعلیم اچھی ہو اس پر عمل کیا جائے۔سماج کے قائم ہونے کے پانچ برس بعد ۱۸۳۳ء میں یہ عالی ہمت شخص اس دارِفانی سے رحلت کرگیا۔

ہمارے مشہور ہم وطن اور مادرِ ہند کے مایہ نازسپوت شاعراعظم ڈاکٹر ٹیگوراسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ "ہندو ، بدھ، مسلم اور مسیحی ہندوستان میں ایک دوسرے سے برسرپیکارنہ ہوں بلکہ چاہیے کہ یہ مذاہب ہمارے ملک میں ایک دوسرے سے مل کر ایک نئی شکل اختیا رکرلیں"۔

۳

ان اصحاب کی یہ خواہش ہے کہ ہندومت اورمسیحیت میں یوں مصالحت ہوجائے کہ ہندو روایات کا درخت جُوں کا توں قائم رہے اوراس میں مسیحیت کا پیوند لگ جائے تاکہ اس میں روحانی پھل نمودارہوجائیں۔چنانچہ مسٹر گاندھی نے یہ کوشش کی ہے کہ کلمتہ اللہ کے اصولوں کوآپ کی شخصیت سے جدا کرکے ان کو ہندوستان کی تمدنی اقتصادی اورسیاسی ترقی کا ذریعہ بنادیں۔ آپ نے منجئی عالمین کے پہاڑی وعظ کے اصولوں سے ہندومت کے مُردہ قالب میں زندگی کا دم پھونکنے کی ہزارکوشش کی ہے لیکن آپ کا نام رہے کیونکہ

ہندومت کے درخت میں مسیحیت کا پیوند نہیں لگ سکتا۔

خودکلمتہ اللہ نے فرمایا ہے:

"کورے کپڑے کا پیوند پُرانی پوشاک پر کوئی نہیں لگاتا۔ نہیں تووہ پیوند اس پوشاک میں سے کچھ کھینچ لیگا یعنی نیا پُرانی سے اوروہ زیادہ پھٹ جائیگی" (مرقس ۲: ۲۰)۔

ہندومت اورمسیحی عقائد کا یکجا ہونا محالِ عقلی ہے۔ کیا برہما ذاتِ مطلق یاذاتِ کل انجیل کا آسمانی باپ ہوسکتا ہے جو کائنات اورانسان سے محبت کرتا ہے؟ کیا الہٰی ذات اورانسانی ذات کی یگانگت محبت کی یکتائی ہوگی یااُس ذات میں فنا ہونے کی یکتائی ہوگی؟ظاہرہے کہ ازروئے منطق ان دومختلف اورمتضاد تصورات میں مصالحت کوہونا محض خام خیالی ہے۔ پس سیدنا مسیح کی اخلاقی تعلیم اورہندو نظریہ کائنات مل کر ایک مرکب نہیں بن سکتا اوراگرنے گا تواُس کے پاؤں کاٹھ کے پاؤں ہونگے اورمثل مشہور ہے کہ:

پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

سیدنا مسیح کی اخلاقی تعلیم سیدنا مسیح کی ذات اورمسیحی تصورِ خدا سے جُدا نہیں کی جاسکتی اورمسیحی تصورخدا مسیحی نظریہ کائنات کی بنیاد ہے۔ ہندونظریہ کائنات اور مسیحی نظریہ کائنات یکا یک جا ہونا اجتماع الضدین ہے۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ ہندومصلحین انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ہندومت کواس کے بے ہودہ اصولوں سے پاک کرکے کسی ن کسی طرح اس مردہ تن میں زندگی کا دم پھونکیں۔ لیکن یہ مصلحین دیگر مذاہب کے اصولوں کو محض ملمع کاری کی خاطر اس مت کو جلادینے کے لئے اختیارکرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی کتب یااصولوں کوخیرباد کہنے کو تیارنہیں۔مثلاً برہمو سماج اُپنشدوں کوآریہ سماجیوں نے ویدوں ، رام کرشن پرہم ہمس کے پیرؤں نے ادوایت کوہندومت کی بنیاد قراردیاہوا ہے۔ ہرایک نے یہ کوشش کی ہے کہ ہندومت کے جنگل میں ایک راہ نکالی جائے جوہندوؤں کواس جنگل سے باہر لے جائے۔ لیکن ان کوششوں کوکامیابی کبھی نصیب نہیں ہوئی ۔ ہندومت کی پے درپے اصلاحی کوششیں اہلِ ہنود کے عوام کو تسخیرنہ کرسکیں اورنہ اُنہوں نے ہندوعوام الناس کو متاثر کیا۔ چنانچہ سواسوسال کے عرصہ میں برہمو سماج والوں کی تعداد کبھی ایک لاکھ سے زائد نہ ہوئی اوررام کرشن کے پیروصرف چند ہزارنفوس ہیں۔ ہندوستان کی پچاس کروڑآبادی میں سے صرف

معدودے چند اشخاص کا اصلاح یافتہ ہندومت کے ساتھ تعلق رکھنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ ان ہندواصلاحی تحریکوں میں زندگی کا دم نہیں ہے۔ لیکن جب مسیحیت کا پیغام اہلِ ہنود کے عوام الناس میں گیا تواچھوت ذات کے لوگ متاثر ہوکر جوق درجوق مسیحی کلیسیا میں شامل ہونے لگے۔

۴

ہم" مسیحیت کی عالمگیری" کے باب چہارم میں ثابت کرآئے ہیں کہ اگر کوئی مذہب صرف اعلیٰ ترین اصولوں کا مجموعہ ہونے پرہی کفایت کرتا ہے تواُس میں یہ صلاحیت نہیں رہتی کہ وہ بنی نوع انسان کوطاقت قوت اورتوفیق عطا کرکے اس قابل بناسکے کہ وہ ان اصولوں پر چلنے مجرداصول اوراحکام کا وجود نجات نہیں دے سکتا کیونکہ مجرداصول اس بات کے اہل نہیں ہوسکتے کہ وہ کسی گنہگارانسان کی کھوئی ہوئی قوتِ ارادی کوازسر نوبحال کرسکیں۔ اعلیٰ ترین اُصول اوراحکام ہدایت کا رستہ بتلاسکتے ہیں۔ نیک اوربد میں تمیز کرکے انسان کو کسی نیک نصب العین کا راہ دکھا کر نصحیت کرسکتے ہیں کہ وہ اس پر چلنے اورمجرد اصول یہ اثر اورتوفیق نہیں عطا کرسکتے کہ کسی گنہگارشخص کواُس کے گناہوں سے چھٹکارا دلواکر اس کوان پر غالب آنے کا فضل ادا کرسکیں۔ مجرد اصول اپنے اندریہ اثر اورطاقت نہیں رکھتے کہ گنہگارشخص کی مردہ قوتِ ارادی میں اپنا مسیحائی دم پھونک کر نئی جان ڈال دیں۔ چنانچہ " بھاگوت گیتا" میں ارجن کہتا ہے:

" اے کرشن ۔ میرا من نہایت بے چین ہے۔ وہ تُند رو ہے اورنہایت ہی سرکش ہے اورمیرے بس کا نہیں رہا۔ میرے لئے اس کو روکنا ایسا ہی مشکل اوردشوار ہے جیسے آندھی کو"(۶: ۳۴)۔

اورکرشن جی خود اقبال کرتے ہیں کہ:

"ہزاروں انسانوں میں سے بمشکل ایک انسان ایسا ہوتا ہے جو کمالیت کوحاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اورہزاروں اہل کمال میں سے بصد مشکل ایک شخص ایسا ہوتا ہے جومیری حقیقت سے واقف ہوتا ہے(۷: ۳)۔

پس برہموسماج اوراس قسم کے دیگر تمام مرکب مذاہب مثلاً بہآئی مذہب وغیرہ جومجرداصول ہدایات ارشادات اوراُصول کا مجموعہ ہوتے ہیں اپنے اندرزندگی نہیں رکھتے اورنہ وہ اپنے مقلدین کوزندگی عطاکرسکتے ہیں۔

٥

علاوہ ازیں کسی مذہب کی ساخت اس قسم کی نہیں ہوتی کہ اُس کے ایک جُز کو نکال کر دوسری جگہ لگایا جاسکے۔ مذہب ایک ایسا کل ہوتا ہے جس کے اجزا میں وہی تعلق ہوتا ہے جو بدن اوراُس کے اعضا میں ہوتا ہے۔ ہم ایک بدن کی ٹانگ اوردوسرے کے بازو اورتیسرے کا سر اورچوتھے کا دھڑاُن کے جسموں سے الگ کرکے ایک نئے انسان کا جسم نہیں بناسکتے۔اسی طرح ہم ہندومذہب کا اچھا اصول چھانٹ کراوراسلام کا ایک دوسرا اصول چن کراورمسیحیت کا تیسرا اصول لے کر اوراُن کو باہم یکجا کرکے ایک زندہ مذہب نہیں بناسکتے۔ یہ مختلف اصول ایک دوسرے سے بے ربط اوربےجوڑ کاٹے ہوئے اعضا کی طرح مردہ ہونگے اوراس ایجاد کردہ مرکب مذاہب میں یہ صلاحیت نہیں ہوگی کہ وہ کسی میں زندگی کا دم پھونک سکے۔

٦

بین الاقوامی جماعت International Fellowship کا ساتواں جلسہ دسمبر۱۹۳۹ء میں ہوا۔ اس جلسہ میں یہ قرارپایاکہ مختلف مذاہب کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ وہ مختلف پہلوؤں پر تاکید سے زوردیتے ہیں اورہرمذہب کی خصوصیت اس تاکید اکید کا نتیجہ ہے پس کسی مذہب کی خصوصیت اُس خاص مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہرایک مذہب کی خصوصیات کوتمام مذاہب عالم کا ایک حصہ تصور کرنا چاہیے ہرمذہب کو چاہیے کہ دیگرمذاہب کواپنی خصوصی تعلیم اوردیگر خصوصیتوں میں شریک کرے۔ اس جلسہ کے خیال میں ا س قسم کے طرزِعمل سے تبدیلی مذہب کی بھی ضرورت جاتی رہیگی۔

تبدیلی مذہب کے مخالفین کوچاہیے کہ اپنے خیالات کوسلجھانے کی کوشش کریں۔ مذکورہ بالا فقرات اس بات کے شاہد ہیں کہ ان اصحاب نے اپنے خیالات کی تنقیع وتنقید کرنے کی زحمت گوارانہیں کی۔ اوّل یہ بات غلط اورحقیقت کے خلاف ہے کہ مذاہب کا اختلاف محض کسی خاص پہلو پرزوردینے اوراُس پر تاکید کرنے کی وجہ سے ہے۔ مثال کے طورپر بدھت ، ہندومت،اسلام اورمسیحیت کے بنیادی اصول کو لیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ ان کے بنیادی اُصول ایک ہی ہیں اوراختلاف محض مختلف پہلوؤں پر تاکید دینے کی وجہ سے ہے؟ہر شخص جوان مذاہب سے سطحی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ ان مذاہب کے باہمی اختلافات

بنیادی اوراصولی ہیں۔ دوم۔ یہ بنیادی اختلافات ان مذاہب کی خصوصیات میں سے ہیں اوریہ حدفاصل کا کام دیتے ہیں۔ان اُصولی اختلافات کی وجہ سے اسلام کے ارکانِ مذاہب ہندومت کے ارکان سے جداگانہ ہیں اورمسیحیت اپنی خصوصی تعلیم کی وجہ سے دیگر مذاہب سے مختلف ہے۔ بالفاظِ دیگرکسی مذہب کی خصوصی تعلیم اس کا امتیازی نشان ہے۔ دری حال اس اجلاس کی قرارداد کے الفاظ کہ کسی مذہب کی خصوصی تعلیم اس کی خصوصیت کا حصہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہرمذہب کوچاہیے کہ دیگر مذاہب کواپنی خصوصی تعلیم اوردیگر خصائص میں شامل اورشریک کرے"۔ اجتماع الضدین اورخرافات کا مجموعہ ہیں۔

۷

ہمیں یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مختلف مذاہب عالم ایک ہی سوال کے مختلف جوابات نہیں بلکہ مختلف سوالات کے مختلف اورمتضاد جوابات ہیں ۔پس وہ کسی فلسفہ کے اُصول کے مطابق ایک ہی نظام میں منظم نہیں کئے جاسکتے ۔ مثلاً اہل یہود کی کتب گناہ کے احساس سے پُرہیں اوروہ اس سوال کا جواب ہیں کہ گناہ سے نوع انسانی کس طرح نجات حاصل کرسکتی ہے؟ لیکن اہلِ ہنود کی مذہبی کتب وید اپنشد اوربھاگوت گیتا میں گناہ کا احساس نمایاں نہیں۔ اس کے برعکس ان کی نظر میں گناہ مایا ہے۔اہل ہنود کوگناہ کا بوجھ نہیں ستاتا بلکہ وہ سنسار کی غلامی کومحسوس کرتے ہیں اوریہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کرم سے کس طرح رہائی حاصل کرسکتے ہیں؟ وہ گناہ سے نہیں بلکہ جنم لینے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں :

" وہ جوجنم اورمرن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔۔۔وہ نجات پاتے ہیں"(۷: ۲۹)۔ جب وہ جوجسم کے اندر رہتا ہے تینو گنوں کوچھوڑدیتا ہے اورجنم اورمرن دکھ اورضعیفی سے چھٹ جاتا ہے ۔ وہی امرت جیل پیتا ہے(۱۴: ۲۰)۔

یہی حال دیگر مذاہب کا ہے۔ ہم منطق کے کس اصول سے بُدھ مت کی اگنا ستک فنائیت ویدوں کی فطریت اہل یہود کے خدا کی احدیت قرآن کی شریعت اورانجیل کے خدا کی محبت کوایک ہی نظام میں منظم کرسکتے ہیں؟ ان مختلف مذاہب میں اگرایک کا منہ مشرق کی طرف ہے تودوسرے کا مغرب کی طرف ہے وہ ایک ہی قطارمیں کس طرح ہمدوش ہوکرایک ہی رُخ چل سکتے ہیں؟

بعض اوقات ہم کو مسیحیت اورہندوازم میں ایک ہی طرح کے مشترکہ الفاظ ملتے ہیں جس سے انسان کو اس قسم کا دھوکا ہوسکتا ہے مثلاً دونوں تجسم کے قائل ہیں لیکن جب ہم ان مشترکہ الفاظ کی تہ کو پہنچتے ہیں توہم کوآسمان اورزمین کا فرق نظر آتا ہے۔ مثال کے طورپر تجسم اوراوتاروں کے سوال کولیں۔ ہندومت انسان کو خدا بتلاتا ہے لیکن مسیحیت اس کے برعکس کہتی ہے کہ خدا نے انسانی شکل اختیارکی۔ ہندومت انسا کو خدا بناکر اُس میں تکبر اورغرورپیدا کرتا ہے اوراُس کی اخلاقی اورمذہبی حس کو مردہ کردیتا ہے۔ لیکن مسیحی عقیدہ انسانی زندگی کے ہرشعبہ کی تقدیس کرتا ہے۔ ہمارے مبارک خداوند کے الفاظ" میں اورباپ ایک ہیں"(یوحنا ۱۰: ۳۰)۔ انسانی روح کے اعلیٰ ترین معراج کا اظہارہیں لیکن رام کرشن پرم ہمس اورسوامی دیویکا نند کے الفاظ جن کا سطوربالا میں اقتباس کیا گیا ہے اس روحانی حالت کی عین ضدہیں۔ مسیحیت کا خدا کوئی مجرد تصور نہیں بلکہ "عمانویل" ہے"یعنی خدا ہمارے ساتھ" علاوہ ازیں ہندوؤں کے اوتاروں کے آنے کی غرض اورمسیح کے مجسم ہونے کی غرض میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن کہتا ہے:

" جب کبھی دھرم میں زوا ل آتا ہے اورادھرم کا سراونچا ہوتا ہے اُس آن میں اوتارکا روپ دھارکردنیا میں آتاہوں تاکہ راستباز کی حفاظت کروں اورگنہگاروں کا ناس کروں، دھرم کومستحکم کرنے کی خاطر میں باربارجنم لیتاہوں۔۔۔۔ میں کسی سے نفرت نہیں رکھتا اورنہ میں کسی سے محبت کرتاہوں"(چوتھا باب)۔

لیکن سیدنا مسیح نے اس دنیا میں جنم لیا تاکہ گنہگاروں کو بچائے "خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جوکوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے"(یوحنا ۳: ۱۶)۔

پس مختلف مذاہب کوہم نہ اُصول کے لحاظ سے نہ ان کی اصطلاحات کی سطحی مشابہت کی وجہ سے ایک نظام میں منظم کرکے ایک نیامرکب مذہب ایجاد کرسکتے ہیں۔

۸

اگرتمام مذاہب انسانی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ۔ تب یہ ممکن ہوسکتا تھاکہ ہم مختلف ممالک واقوام کے تجربوں اوراُصولوں کو یکجا کرکے اُن کو کانٹ چھانٹ کرایک نیامذہب بناسکتے جومختلف اصولوں کو معجونِ مرکب ہوتا۔ لیکن جیسا ہم

سطور بالا میں بتلاچکے ہیں۔ مذہب انسانی ایجاد کا نام نہیں اورنہ وہ کسی انسان نے بنایا ہوا ہے۔ مذہب انسانی مساعی جمیلہ کامرہون احسان نہیں ہوتا بلکہ حقیقی مذہب خدا کی بخشش ہے جس کو ہم ایمان کے وسیلے حاصل کرتے ہیں۔ بالخصوص مسیحیت خدا کا مکاشفہ ہے۔ وہ ایک مافوق الفطرت شے ہے جس کا وجود انسانی فطرت پر منحصر نہیں ہے" جواُوپر سے آتا ہے وہ سب سے اُوپر ہے جوزمینی ہے وہ زمین ہی سے ہے اورزمین ہی کی کہتا ہے"(یوحنا ۳: ۳۱)۔ دیگر مذاہب میں اور مسیحیت میں اس لحاظ سے بعدالمشرقین ہے۔ دیگر مذاہب کے بغیر بھی انسان خدا کا علم حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن مسیحیت کے بغیر خدا کی معرفت اوراس کا حقیقی علم ناممکن امر ہے۔ مسیحی ایمان کے اجزا ایسے نہیں کہ ان کے ساتھ انسان جوچاہے سوکرے یاایک جزوکی جگہ دوسرے پیوند کردے۔ وہ ایک انجیل ہے جس کی منادی تمام اقوام عالم میں کی جاتی ہے وہ ایک خوشی کی خبر ہے کہ خدا خود گنہگارکی خاطر مجسم ہوا ۔ وہ ایک پیغام ہے جوروئے زمین کے افراد کے لئے ہے۔ جس طرح خوشی کی خبر اورپیغام میں کتروبیونت نہیں کی جاسکتی اسی طرح مسیحیت میں کتروبیونت کا امکان نہیں ہے۔ ہر مسیحی کا فرض ہے کہ اس بشارت کے پیغام کو تمام وکمال دنیا کے گوشہ گوشتہ تک پہنچائے ۔چونکہ کوئی مسیحی مسیح کے بغیر خود زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہذا وہ اس خیال کوبھی گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کے ابنائے جنس جواس کے گوشت اورخون ہیں مسیح کے بغیر زندگی بسرکریں۔

باب دوم

ہندو فلسفہ اورمذہبی رواداری

ہم نے گذشتہ باب میں یہ بتلایا تھاکہ جولوگ ہندو دائرہ میں ہیں اُن کے لئے کسی خاص عقیدہ کا پابند ہونا لازم نہیں ۔ ویدوں کا ماننے والا ہندو ہے اوراُن کو نہ ماننے والا بھی ہندو کہلاتا ہے۔ کروڑوں دیوتاؤں کوماننے والا ہندو اور ایک خدا کو ماننے والا بھی ہندو، اورخدا کے وجود سے انکا رکرنے والا بھی ہندو کہلاتا ہے۔ اپنشدوں اورسمرتیوں کو ماننے والا اورنہ ماننے والا بھی ہندو کہلاتا ہے۔ گئورکھشا کرنے والا بھی ہندو اورمسٹرگاندھی کی طرح گائے کو مرواڈالنے والا بھی ہندو کہلاتا ہے۔ پس ان کے لئے تمام مذاہب یکساں اوربرابر ہوتے ہیں۔ویدوں کے ماننے والے کے مذہب کواُن کو نہ ماننے والوں پر فوقیت نہیں۔ ایک خدا کو ماننے والا کا مذہب بُت پرست کے مذہب سے بہترنہیں ہوتا۔

ہندو فلسفہ کا بھی امتیازی نشان مذہبی رواداری ہے۔ ہندو[7] ہندوفلسفہ عام طورپر دوقسم کا ہوتا ہے۔ ناستک اورآستک ۔ناستک فلسفہ ویدوں کوالہامی نہیں مانتا اور تین قسم کا ہوتا ہے۔ جین ناستک اور چارواک ناستک ۔ آستک فلسفہ چھ قسم کا ہے۔ (۱۔) کپل کا سمکھیا اور(۲۔) پاتنجلی کا یوگ سوتر۔ اگرچہ دونوں فلسفے بعض باتوں میں متفق ہیں لیکن یوگ سوترا ایشور کو آتما سے الگ شے مانتا ہے اوریوگ عمل پر زوردیتا ہے پرسمکھیا ایشور کو نہیں مانتا۔ (۳۔) جیمنی کا پورویمانسادرحقیقت فلسفہ نہیں ہے کیونکہ ویدوں کے اُس حصہ کی شرح ہے جس کا تعلق قربانیوں کے ساتھ ہے۔ (۴۔) اُترمیمانسایا ویدانت سوتر یابرہم سوتر لفظ ویدانت کے معنی ہیں"وید کاآخر" یعنی اُپنشد ۔ اس فلسفہ میں اپنشد کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ اس کی سب سے قدیم شرح شنکر آچاریہ کی شرح ہے اوروہ اتنی مقبول ہے کہ بالعموم ویدانت سے مطلب شنرکی شرح لیا جاتا ہے جوہمہ اوستی خیالات کے مطابق لکھی گئی ہے لیکن دوسرے لوگوں نے برہم سوتر کی جوشرح لکھی ہے اورجس کو ویشنو اور شواور راما یت وغیرہ مانتے ہیں وہ ہمہ اوستی خیالات کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ ثنویت کے قائل ہیں اورخدا اوردنیا کو ایک ماننے کی بجائے دومختلف ہستیاں مانتے ہیں۔ان لوگوں میں رامائج، ولبھ، مدھو، سری کنٹھ وغیرہ مشہور شارع ہیں جنہوں نے برہم

[7] See Das Gupta, History of Indian Philosophy Vol.1

سوتروں کی ایسی تشریح کی ہے جوشنکر کی شرح کے متضاد ہے۔ان میں سے رامانج کا فلسفہ زیادہ مشہور ہے۔ (۵۔) گوتم کانیا سوتر منطق پر اور(۶۔) کناڈ کاویس شکھ سوترعلم طبعیات اورعلم بعد الطبیات پرزوردیتا ہے۔

مندرجہ بالامختصر بیان سے ناظرین پر ظاہر ہوگیاہوگا کہ جس طرح ہندومت کے کوئی مخصوص عقائد نہیں۔ اسی طرح ہندوفلسفہ اصولوں کے کسی خاص مجموعہ کا نام نہیں۔ جس طرح ایک ہندومذہبی اُمور میں جس اُصول کو چاہے مان سکتا ہے اورجس کا انکارکرنا چاہے کرسکتا ہے۔ اسی طرح فلسفیانہ اُمورمیں ہندو جس اصول کو چاہے مان سکتا ہے اورجس کا انکارکرنا چاہے کرسکتا ہے۔ وہ کسی مذہب یااُصول کا پابند نہیں ہوتا۔ پس اس کے لئے ہرقسم کے مذاہب اورہر قسم کے فلسفیانہ خیالات برابر ہوتے ہیں۔

یہاں ہم ہندوفلسفہ کی تفصیلی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ہم کو اس رسالہ میں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہندوفلسفیانہ خیالات کا اثر ہمارے موضوع پر کیا ہے؟ فلسفیانہ خیالات کے اختلاف کے باوجود بالمعوم ہندوفلسفہ سے مُراد شنکر کی ویدانت لی جاتی ہے اورہندوفلسفہ کے اُصول سے کرم اورتناسخ کے اُصول مُراد ہوتے ہیں۔پس ہم اسباب میں صرف ان پر بحث کرنے پر اکتفا کریں گے۔اس بحث سے ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہندومذہب وفلسفہ کے اُصول قرآنی اورانجیلی اُصول سے جُدا اورمختلف ہیں اوریہ اختلاف اس قسم کا ہے کہ دونوں قسم کے اُصول برابر طورپر صحیح اوردرست نہیں ہوسکتے اورچونکہ یہ اُصول ایک دوسرے سے کلیتہً متضاد ہیں۔لہذا دونوں کا صحیح ہونا محال عقلی ہے۔ اگر ہندومت کے اُصول فلسفہ فی الحقیقت درست ہیں تومسیحیت کے اُصول باطل ہیں۔ لیکن اگرمسیحیت کے اُصول درست ہیں تو ہندوفلسفہ کی بنیادوں کے غلط ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

۲

ہندوفلسفہ ہمہ اوستی مذہب ہے اوربالفاظِ پروفیسر سورلے(Sorley) اس مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ:

"ہر انفرادی شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنے مخصوص طوروطریقہ سے اُس وحدت الوجود کی مظہر ہے جوکل بھی ہے۔ اس کل میں ایک ایک شے کی جگہ مقرر رہے اوریہ جگہ اس کے وجود کے

لئے لازمی ہے خواہ وہ شے مادی ہو یا روح سے متعلق ہو۔ خواہ وہ انسان ہو یا کیڑا ہو۔ خواہ وہ ایک مقدس فرد ہو یا گنہگار ہو"۔

چونکہ اس وحدت کل میں ہرایک شے اپنے مخصوص طریقہ سے مطلق کی مظہر ہے۔ اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ سب مذاہب اپنی اپنی یکساں طورپر حق اورراست تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مایہ ناز فلاسفر اورمسلم الثبوت اُستاد پروفیسر رادھا کرشن کہتے ہیں:

" مختلف مذہبی روایات درحقیقت مختلف زبانیں ہیں جن کے ذریعہ مذہب کی حقیقت پیش کی جاتی ہے۔ اگرچہ زبانوں میں اختلاف ہے تاہم سب کا مفہوم ایک ہی ہوتا ہے۔ عبادت کے تمام طریقے موثر اور بامعنی ہیں خواہ بظاہر وہ ہم کو لغو اور بے معنی خرافات ہی نظر آئیں گے" Idealist View of Life,p.119-22

اس نامور فلاسفر کے خیال میں ہندومت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ:

"وہ صلح آمیز نظر سے ہرایک بات کو قبول کرلیتا ہے اورکسی ایک جامد عقیدہ پروارفتہ ایمان نہیں رکھتا" Hindu View of Life.p.59 -

اسی کتاب میں ایک اورجگہ آپ فرماتے ہیں:

"ہندومت شامی مذاہب کی اس دیوانگی سے پاک ہے کہ نجات صرف کسی ایک مذہب میں ہے اوراس کو حاصل کرنے کے لئے چند مخصوص عقائد کا ماننا لازمی ہےکیونکہ ان کا منکر جہنم کا سزاوار ہوجاتا ہے"۔

پروفیسر صاحب موصوف کے خیالات ہندوفلسفہ اور ہندومذہب کے اُصول یاقضایا کے منطقی نتائج ہیں۔ اگرہمہ اوستی قضایا کومان لیا جائے تومذہبی مصالحت اوررواداری ایک ایسی بدیہی بات ہوجاتی ہے جوثبوت کی محتاج نہیں رہتی۔ چونکہ ہرشے اپنی اپنی جگہ اپنے مخصوص طوروطریقہ سے ایک ہی کل کی مظہر ہے لہذا ہرمذہب اپنی اپنی جگہ قابل قدر ہے اورتمام مذاہب کے بانی اوراُن کے اُصول اپنے اپنے مخصوص طریقہ سے اُسی ایک کل کے مظہر ہیں لہذا وہ یکساں طورپر وقعت کے قابل ہیں اورکسی مذہب یااس کے بانی کوکسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔

پروفیسر رادھا کرشن کا یہ خیال ہے کہ جس طرح کسی زمانہ میں سیاسی دنیا میں ایک جمعیت الاقوام کا وجود تھا اسی طرح مذاہب عالم کی ایک فیڈریشن یاوفاق (جمعیت المذاہب) ہونی چاہیے۔ لیکن پروفیسر صاحب اس امر کو فراموش کردیتے ہیں کہ

جمعیت الاقوام میں تمام اقوام کی حیثیت یکساں ہوتی ہے اوروہ سب سیاسی طورپر خودمختار ہوتی ہیں۔ لیکن جب مذاہب عالم میں بنیادی اوراصولی فرق ہیں تو ان کا پلہ یکساں نہ رہا۔پس بعض مذاہب راست اوربعض باطل ہوئے۔ جمعیت المذاہب کے وجود کے لئے لازم ہے کہ تمام مذاہب یکساں طورپر اقوام عالم کی طرح خود مختار ہوں اوران کے بنیادی اُصول ایک ہی ہوں۔ ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ ادیانِ عالم کا کسی ایک اُصول پر بھی اتفاق نہیں ہے۔ دریں حالت ہم مذاہب عالم کے مجمع کثیر کی جمعیت المذاہب کی ایک لڑی میں کس طرح منسلک کرسکتےہیں؟ جرمن فلاسفر بیرن فون ہیوگل Baron Von Hugel درست کہتا ہے کہ:

" یہ بات غلط ہے کہ تمام مذاہب یکساں طورپر درست ہیں اوریکساں طورپر پاکیزہ ہیں اوریکساں طورپر پھلدارہیں"۔

حق تویہ ہے کہ مسیحیت ہندومت کی طرح ایک فلسفہ نہیں بلکہ انجیل یعنی خوشخبری ہے۔ وہ ہرکس وناکس کے لئے جونفس امارہ کا غلام ہوچکا ہے ایک بشارت کا پیغام ہے جواس کو بتلاتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے چھٹکارا حاصل کرسکتا ہے۔

حکمت وفلسفہ کا ریست کہ پایا نش نیست
یسلی عشق ومحبت بدبستانش نیست

ہندومت کے برعکس مسیحیت ایک مکاشفہ ہے جوکامل ہے اگرچہ ہمارے فہم اس کامل طورپر سمجھنے سے قاصر ہوں لیکن ہمارے ادراک اورفہم کے ناکامل ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مکاشفہ بھی غیرمکمل ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہم خدا کی ذات کونہیں جان سکتے۔ لہذا ان کواس بات میں مطلق تامل نہیں ہوتاکہ وہ مسیح کو یاکرشن کویاشو کویارام کو یاکالی کوخدا مان لیں لیکن مسیحیوں کے نزدیکمسیح ان لاتعداد مظہروں میں سے خدا کا ایک مظہر نہیں۔ بلکہ ان کا یہ ایمان ہے کہ خدا نے اپنی ذات کا کامل مکاشفہ عطا کیا ہے۔ جوصرف سیدنا مسیح اورصرف سیدنا مسیح میں ہے۔ لہذا وہ ان تمام اوقات کو فرضی اورغیرمکمل جا کران کورد کرتے ہیں:

خدا اورکائنات کا رشتہ

گذشتہ باب میں ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ ہندوستان کے تین بڑے مذاہب یعنی ہندوازم، اسلام اورمسیحیت میں بنیادی اوراُصولی فرق ہے اورچونکہ ان میں اُصولی فرق ہے لہذا وہ تینوں یکساں طورپر صحیح نہیں ہوسکتے۔ مثلاً اگرچہ تینوں مذاہب اپنے اپنے مخصوص عقائد کے مطابق خدا کو مانتے ہیں تاہم خدا کی ذات

وصفات کی نسبت اُن کے تصورات میں بعدالمشرقین ہے۔ اگریہ سوال کیا جائے کہ خدا اورکائنات کے درمیان کیارشتہ اورتعلق ہے توہندومت اوراسلام اورمسیحیت کےجوابات مختلف اور متضاد ہونگے۔اگرہندوازم یااسلام کا جواب درست ہے تومسیحیت کا جواب لاکلام غلط ہوگا لیکن اگرمسیحیت کا جواب درست ہے توہندومت اوراسلام کے جوابوں کے غلط ہونے میں کسی قسم کی گنجائش نہیں رہ سکتی کیونکہ اصول منطق کے مطابق اجتماع الضدین محال عقلی ہے ۔ انشاالله اس باب میں ہم یہ ثابت کردکھائینگے کہ مذکورہ بالا سوال کے جوابات میں سے صرف مسیحیت کا جواب ہی اُصول منطق وفلسفہ کے مطابق راست اوردرست ہے اورہندوازم اوراسلام کے جوابات غلط ہیں۔

۲

خدااورکائنات کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس سوال کے تین مختلف اورمتضاد جواب ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ خدا کائنات میں ساری اورطاری ہے جوکچھ ہم کوحواس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے سب اُس کا مظہر ہے:

ع۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر توہی توہے

اُس کی ذات اس کائنات کا علاوہ اوراس کے باہر موجود نہیں ۔ ہمہ اوست یہ جواب ہندومت کا ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن کہتے ہیں:

"میں سب کو کرنے والا بُود اورنابُود ہوں۔ سب سے اعلیٰ مالک اورمختار ہوں۔ مجھ میں سب عالم اس طرح گوندھا پڑا ہے جس طرح منکے کسی ہارمیں پروئے ہوتےہیں ۔میں آب میں رس ہوں۔ انسان میں طاقت ہوں ۔ مہروماہ میں نورہوں۔ ویدوں میں اونکارہوں۔ اکاش میں شبد ہوں۔ مٹی میں بُوہوں۔ آتش میں جلن ہوں۔ سب عالم میں جان ہوں۔ میں خودہی عابد ہوں خودہی معبود ہوں اورخودہی عبادت ہوں۔ داناؤں میں دانائی ہوں۔ موجودات میں تخم ہوں۔ حشمت والوں میں حشمت ہوں طاقت ورمیں طاقت ہوں انسان میں شہوات ہوں"(۷: ۱۱تا۶)۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ خدا کی ذات ایسی منزہ صفات ہے کہ وہ مخلوقات سے کلیتہً بالا اوربرترہے۔ خدا ایک ایسی پاک ہستی ہے کہ اُس کے ساتھ کائنات کی کامل رفاقت ناممکن اورمحال ہے یہ جواب اس کا ہے۔

پہلے جواب کے مطابق فطرت اور مافوق الفطرت میں کوئی امتیاز نہیں۔ سب کچھ اُسی کا ظہور ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مذہب کا یہ کام ہے کہ کثرت کے پردے کو چاک کردے اورانسان کو وحدت کی حقیقت تک پہنچادے۔ تغیرات کا یہ عالم ہے۔ اوریہ دھوکا نہ صرف ہمارے انفرادی زندگی میں بلکہ کائنات میں بھی پایا جاتا ہے۔ مذہب کا یہ کام ہے کہ اس دھوکے اورسُراب کودُور کرکے ہم کو وحدت الوجود سے ملادے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگرخدا اپنی کائنات میں ساری وطاری ہے توہم ایسی ہستی کے ساتھ کسی قسم کی حقیقی رفاقت نہیں رکھ سکتے۔ ہندو فلسفہ کے نزدیک نوع انسانی اُس مسرف بیٹے کی طرح ہے جواپنے باپ کے گھر سے دورمایا کی پھیلوں سے اپناپیٹ بھرتا ہے لیکن جب وہ باپ کے گھر واپس جانے کا ارادہ کرتا ہے توباپ کا گھر خالی پڑا دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی باپ ہے نہیں جواپنے گم گشتہ بیٹے کو گلے لگالے۔ ہمارا اورذات مطلق کا وجود ایک ہی ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کے ساتھ رفاقت نہیں رکھ سکتا پس اس قسم کے رشتہ کو لفظ "رفاقت" سے منسوب کرنا درحقیقت الفاظ" رفاقت" اور" رفیق" کو تروڑ مروڑ کرایک بے معنی لفظ بنادینا ہے۔

اگردوسر جواب یعنی اسلام کا جواب صحیح ہے کہ خدا کی ذات اس قدر منزہ صفات واقع ہوئی ہے کہ وہ کائنات سے کلیتہً برتروبالا ہے۔ تویہ ظاہر ہے کہ انسان ایسی صفات رکھنے والے ہستی سے کسی طرح بھی حقیقی رفاقت میں رکھ سکتا۔ قرآن کا خداایک ایسا ہیبت ناک مطلق العنان بادشاہ ہے جس کے سامنے انسان لرزہ باندام رہتا ہے۔ آقا اورغلام میں کوئی حقیقی رفاقت نہیں ہوسکتی۔ سیدنا مسیح نے کیا خوب فرمایا ہے:

" غلام نہیں جانتا کہ اس کا مالک کیا کرتا ہے"(یوحنا۱۵: ۱۵)۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں مختلف اورمتضاد نظریہ ایک ہی نتیجہ پہنچتے ہیں کہ خدا اورانسان میں باہمی رفاقت امر محال ہے۔ کیونکہ ہمہ اوستی ادوائت ویدانت اُصول کے مطابق صرف حدا یا برہما ہی حقیقی وجود رکھتا ہے اورباقی تمام چیزیں جن کا تعلق زمان ومکان کے ساتھ ہے مایا اوردھوکا ہیں۔

خواب تھا جوکچھ کہ دیکھا جوسنا افسانہ تھا

اسلام کے مطابق خدا اپنی کائنات سے اس قدر بلند وبالا اوربرتر ہے کہ اس کی حقیقت کے سامنے انسانی زندگی کی کچھ حقیقت یاقدروقعت نہیں رہتی۔ پس تمام اشیا جن کا تعلق زمان ومکان کے

ساتھ ہے۔ بے حقیقت ہیچ اور بے معنی ہوجاتے ہیں۔خدا اورانسان کے درمیان رفاقت بے معنی ہوجاتی ہے کیونکہ خالق کی ازلی مرضی اوراٹل ارادہ کے سامنے مخلوق کی فانی مرضی اورانسانی ارادہ کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔

اگرخدا کائنات سے صرف برتروبالا ہے اوراس کی ذات کی طرف سے بے نیازاوربے پرواہے تواُس کی ہستی محض ایک تماشبین یاناظر کی سی ہے جس کا کام عالم شہود کا مشاہدہ کرنا ہے اوربس۔اس قسم کا الہٰی تصور ہماری روحانی جدوجہد میں ممدومعاون ہوسکتاہے ۔ کیا اس میں یہ طاقت ہوسکتی ہے کہ ہماری کشمکش میں ہم کو راست نصب العین کو حاصل کرنے کی جانب راغب کرسکے؟

۳

تیسرا جواب مسیحیت کا جواب ہے ۔ مسیحیت کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے اس کائنات کواپنے کلام کے ذریعہ خلق کیا ہے(یوحنا ۱: ۳)۔ وہ کائنات کے اندر ہے(یرمیاہ ۲۳: ۲۴)۔ اوراس سے بلندو بالا اورپرے بھی ہے(زبور ۸۳: ۱۸)گوتمام مخلوق خدا میں جیتے اورچلتے پھرتے ہیں اوراُسی میں وجود رکھتے ہیں (اعمال۱۷: ۲۴تا ۲۸)۔ تاہم خدا اورکائنات کا باہمی تعلق کُل اورجز کا سا نہیں ہے۔ خدا اس کائنات میں ساری اورطاری ہے اورساتھ ہی ماوراء بھی ہے۔ وہ ایک ایسی وحدت الوجود ہستی ہے(استثنا ۴: ۳۵)۔ جوغیر مشخص نہیں ہے بلکہ جوشخصیت کی صفات ہم میں محدود طورپرموجود ہیں وہ محض اس وجہ سے ہیں کیونکہ وہ خدا میں لامحدود طورپر موجود ہیں خدا روح ہے(یوحنا ۴: ۲۴)اوراس کی ذات محبت ہے (۱یوحنا ۴: ۸، ۱۶)وہ ایک کامل ہستی ہے (متی ۵: ۴۸۔ زبور۹۹: ۹ وغیرہ)۔ برحق ہے(یوحنا ۱۷: ۳) نیکی کا سرچشمہ ہے اورسراسر نیک ہے(زبور۲۵: ۸۔ متی ۱۹: ۱۷ وغیرہ) گووہ ذاتِ مطلق قادر قدیم (خروج۶: ۳) علیم، خبیر اورہرجاحاضروناظر ہے(زبور۳۹: ۱تا ۶) تاہم اس نے انسان کو ایک خودمختار ہستی ہونے کی عزت بخشی ہے۔ اوراس کو غافل خود مختاربناکراس بات کا اہل بنایا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ حقیقی رفاقت رکھ سکے۔ یہ ذاتِ مطلق کوئی مجرد تصورنہیں ۔ بلکہ یہ واجب الوجودہستی بنی نوع انسان کا باپ ہے(متی۶: ۹ وغیرہ)۔جس نے ایمانداروں کو اپنے فرزند ہونے کا حق بخشا ہے (یوحنا ۱: ۱۲)۔ پس کل دنیا کے ایماندار خواہ وہ کسی ملک قوم نسل یارنگ کے ہوں خدا باپ کی رفاقت

حاصل کرسکتے ہیں۔اس رفاقت کی مثال ایسی ہے جیسی دنیاوی باپ اوربیٹے میں رفاقت ہوتی ہے۔ یعنی یہ رفاقت دوآزاد فاعلِ خود مختار ہستیوں میں رفاقت ہے۔ پس وحدت الوجود بنی نوع انسان کے لاتعداد افراد کے ساتھ حقیقی رفاقت رکھتا ہے۔ کائنات کی کثرت دھوکا اورسراب یامایا نہیں بلکہ اس کثرت کا وجود خارجی حقیقت رکھتا ہے اوراشرف المخلوقات میں حقیقی طورپر یہ صلاحیت موجود ہے کہ خدا کے ساتھ بغیر اپنی ذات کو قائم بالذات میں فنا کئے حقیقی رفاقت رکھ سکے۔

"ہماری رفاقت باپ کے ساتھ اوراس کے حبیب سیدنا مسیح کے ساتھ ہے (۱یوحنا۱: ۳)۔

مشہورجرمن فلاسفرپروفیسرآٹوہم کوبتلاتا ہے کہ:

ہرملک میں وہ تمام مذاہب جن کی بنیاد محض عقل یا اخلاقیات پر ہے سسکیاں بھررہے ہیں اورصفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹتے جارہے ہیں اوران کی جگہ وہ مذہب لے رہا ہے جس کی بنیاد وہ روحانیت پر ہے کیونکہ ان میں سرے سے وہ اپیل موجود نہیں جواس خیال میں موجود ہے کہ ایک ایسی واحد ہستی کے ساتھ رفاقت رکھی جائے جس کو جاننا اورجس سے محبت رکھنا انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے کیونکہ اسی رفاقت کی وجہ سے انسانی روح کے تمام قویٰ بڑھتے اورنشوونما پاتے ہیں[8]۔

اسلام کے عقائد کے برعکس مسیحیت کا یہ عقیدہ ہے:

"اگرچہ خدا اپنی کائنات سے کہیں بلندوبالا اوربرتر ہے تاہم اُس کوپسند آیا کہ انسان کی زندگی اورروح کووہ اس قدر وقعت دے کہ یہ مشتِ خاک ہیچ اوربے حقیقت ہونے کی بجائے کائنات کی سب سے بیش قیمت شے متصورہو(متی ۱۶: ۲۶۔ مرقس ۸: ۳۶)۔ خدا نے انسان سے اس قدرمحبت رکھی کہ اس نے انسانی نجات کوپورا کرنے کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی دریغ نہ کیا(یوحنا۳: ۱۶)۔ خدا اپنے بے حد رحم اورفضل کی وجہ سے گنہگار انسان سے محبت کرکے اس کوتوبہ کی جانب مائل کرتا ہے(لوقا ۱۵باب) تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کرکے خدا کے ساتھ حقیقی رفاقت رکھ سکے۔

ہندوفلسفہ ایک غیر مشخص طاقت کو مانتا ہے۔ لیکن مسیحیت کے مطابق خدا کے ساتھ ہمارا اُس قسم کا تعلق نہیں جوعلمِ ریاضی کی کسی صداقت یافلسفہ کے کسی اُصول کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس خدا اورانسان کا باہمی تعلق اُس رشتہ کی

---

[8] Otto, Idea of the Holy

مانند ہونا چاہیے جوایک فاعل خودمختار کا دوسرے فاعل خود مختار شخص کے ساتھ ہوتا ہے اورجوہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں آتا ہے ۔ مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ جب کبھی انسان خدا کے ساتھ رفاقت وقربت کا تعلق قائم رکھنے سے قاصر رہتا ہے وہ کسی علمی یا عقلی مغالطہ کا شکارنہیں ہوتا بلکہ وہ گناہ کا مُرتکب ہوتا ہے ۔ اس طریقہ کار سے ہم کسی غلط علمی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ بلکہ ہم خدا کی محبت سے روگردانی کرتے ہیں۔

اب غبی سے غبی شخص پر بھی یہ ظاہر ہے کہ ہندومت اوراسلام کے جوابات اورمسیحیت کےجوابات میں بعدالمشرقین ہے۔ مقدم الذکر مذاہب اپنے اپنے نقطہ خیال سے اُس بات کا انکار کرتے ہیں جس پر مسیحی اُصول اس قدراصرارکرتے ہیں ۔ دریں حال ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ تینوں جوابات یکساں طورپر صحیح ہیں؟ کوئی صحیح العقل انسان مذکورہ بالا تمام فلسفیانہ نظریوں کویکساں طورپر درست اورراست نہیں مان سکتا کیونکہ یہ مختلف نظریہ جات نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ازروئے منطق متناقص اورمتضاد ہیں۔ لیکن وہ مختلف مذاہب کے اُصول کے منطقی نتائج ہیں۔ چونکہ یہ نظریہ جات یکساں طورپر درست اورصحیح نہیں ہوسکتے لہذا وہ قضایا جن کے یہ نتائج ہیں یعنی مختلف مذاہب کے اصول بھی یکساں طورپر درست اورصحیح نہیں ہوسکتے ۔ اگرخدا اورانسان میں رفاقت ممکن ہوسکتی ہے اوراگریہ رفاقت مذہب کا حقیقی نصب العین ہے تویقیناً ہندوازم اوراسلام کے جوابات میں صداقت نہیں اورمسیحیت نے ایسا راستہ کھول دیا ہے جس سے خدا اورانسان میں رفاقت ہوتی ہے اوریہ قربت روزبروز ترقی کرکے انسانی زندگی کی تقدیس کرتی ہے۔

۴

ادوایت ویدانت کے عقیدہ کے مطابق اس دنیا کی ہستی حقیقی وجودنہیں رکھتی ۔ بقول شخصے

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا

چونکہ برہم آتما ہی ایک واحد ہستی ہے جوحقیقی ہے پس دنیا ایک ہیچ اوربے معنی شے مایارہ جاتی ہے جس سے کنارہ کشی کرنا ایک لازمی امر ہے کیونکہ صرف تارک الدنیا ہوکر ہم واحد ہستی تک پہنچ سکتے ہیں جس کا نام برہما ہے۔ اسی طرح اسلام کے اللہ کے ارادہ اوررضا کے سامنے انسانی ہستی بے معنی رہ جاتی ہےلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ خدا کی ذات کے سوا

سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ اسی کی حکومت ہے اوراسی کی طرف سے تم سب کو لوٹ جانا ہے" (قصص آیت ۸۸)۔ پس دومختلف اور متضاد مذاہب ہندومت اوراسلام جن میں بظاہر بعد المشرقین نظر آتا ہے بلاآخر ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اورہم کو ای ایسی ہستی پر ایمان لانے کی دعوت کرتے ہیں جس کے سامنے کائنات دنیا اورانسان بے حقیقت اوربے مایہ چیزیں ہیں۔

اہل ہنود کویہ احساس ہے کہ اُن کا مذہب اورفلسفہ اُن کو اس مشکل میں مبتلا کرتا ہے۔ بالخصوص یہ بات ڈاکٹر رابندراناتھ ٹیگور جیسے روشن ضمیر انسان اورسررادھاکرشن جیسے فاضل عالم سے چھپ نہیں سکتی لہذا یہ دونوں اصحاب موجودہ علم اورحالات کی روشنی میں ہندو فلسفہ کی نرالی تفسیر کرتے ہیں ۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف ادوائت کی نسبت فرماتے ہیں کہ:

" اس کی تعلیم محبت ہے یعنی کائنات اورخدا کے ساتھ یکتائی ہے"[9]۔

سررادھا کرشن لفظ" مایا" سے مطلب" بھید" لیتے[10] اوریوں مایا کی تعلیم کوہندو مت اورفلسفہ سے خارج کرتے ہیں لیکن ہندومت

[99] Tagore, Letters to a Friend.p.71

[10] Idealist View of Life.p.344

سررادھا کرشن کے نظریہ زندگی کا اس قدرمخالف ہے کہ جس شے کو سر موصوف ہندومت بتلاتے ہیں وہ ہندومت نہیں ہے کیونکہ مایا کی تعلیم ہندومذہب کا جزولاینفک اورہندوفلسفہ کی روح روا ں ہے۔لیکن اگر ان اصلاحی کوششوں کوپرکھا جائے توہم پر یہ ظاہر ہوجائیگا کہ ان مصلحین کے فلسفہ میں بھی برہما اورذاتِ مطلق کا انسان اورکائنات سے کسی قسم کا حقیقی تعلق واسطہ یارشتہ نہیں۔ان اصحاب کی نئی شرح کے الفاظ کی سطح کے نیچے وہی قدیم عقیدہ ادوایت ومایا ملتا ہے جس کی تنقید سطوربالا میں کی گئی ہے۔

اس رشتہ کا اثر اخلاقیات

اگرکائنات اورانسانی زندگی محض مایاسراب اوردھوکا ہے اور حقیقت سے یکسر معریٰ ہے توخواہ ہم اس نتیجہ پر ادوایت ویدانت کی راہ سے اورخواہ اسلام وقرآن کی راہ سے پہنچیں۔ بہر حال انسان کےفاعل خود مختار ہونے کا انکار لازم آتا ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں:

"تمام کرم انسان کی سرشت کے گنوں کی وجہ سے صادرہوتے ہیں لیکن نادان ہنکارکرکے یہ سمجھتا ہے کہ اُن کا کرنے والا میں ہوں"(۳: ۲۷)۔ " اس سنسار میں ایک لحظہ بھر کے لئے بھی کوئی

شخص بغیر کرم کئے نہیں رہ سکتا کیونکہ پرکرتی کے گُن ہرایک شخص کوخاص کرم کرنے پر مجبور کرتے ہیں اوروہ لاچار ہوکر ان کوکئے جاتا ہے"(۳: ۵)۔ اے ارجن ۔ تم اپنی ذات کے کرم کی وجہ سے مقبد ہو۔ جوچیزتم مایا کی وجہ سے نہیں کرنا چاہتے۔ وہ تم کو لاچار ہوکر مجبوراً کرنا پڑے گی۔ خدا تمام موجودات میں موجود ہے۔ اورمایا کی طاقت سے وہ تمام لوگوں کوگھمار کے پہیہ کی طرح گھماتا ہے "(۱۸: ۶۰ تا ۶۱)۔

ادوائت ویدانت کا فلسفہ کرم کے اُصول کے ساتھ وابستہ ہے جس کے مطابق انسان کی زندگی کا مستقبل حال پر اورحال ماضی پر اورماضی اس سے پہلے کہ ماضی بعید پر منحصر ہے۔ اندریں حالات یہ بات انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ فاعل خود مختار ہو۔ کیونکہ انسان کی زندگی علت ومعلول کے سلسلہ کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔ اوراس قدوسلاسل سے مخلصی حاصل کرنا امر محال ہے کیونکہ یہ ویدانتی قضایا اورکرم کے اصول کا منطقی نتیجہ ہے ۔ پس ہمارے ہندوبھائی نومیت اوراثر آفرینی اورخود تاآثری کے ذریعہ اس سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۲

اسلامی تعلیم کے مطابق صرف ایک ہی رضا ہے جو اس کائنات میں درحقیقت کا پرواز ہے اوروہ رضائے الہٰی ہے۔ انسان کا ارادہ کوئی اصلیت وحقیقت نہیں رکھتا۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ مسئلہ تقدیر پر ایمان ہے۔پس انسان فی الحقیقت فاعلِ خود مختار نہیں رہتا۔ ہندوؤں کے اُصول کرم کے مطابق انسان کی زندگی نیچر اور فطرت کے قانون کی غلام ہے جومقررہ اورغیرمبدل طورپر منظم ہے۔ اسلام میں انسان کی زندگی رضائے الہٰی اورتقدیر کی زبردست زنجیروں میں جکڑی پڑی ہے کیونکہ کائنات میں تقدیر الہٰی کے سوا کوئی دوسری طاقت کام نہیں کرتی اورلفظ اسلام کے معنی برضائے الہٰی گردن خم کردن" ہے ۔ ہم نے اس مضمون پر اپنی کتاب "دین فطرت ۔اسلام یامسیحیت؟" میں مفصل بحث کی ہے۔پس ناظرین کی توجہ اس رسالہ کی طرف مبذول کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۳

چونکہ ہندومت اوراسلام میں انسانی زندگی اصلی معنوں میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی ہے لہذا تمام اخلاقی مساعی اورکوششیں جوانسان اپنی روحانی ترقی کوحاصل کرنے کے لئے بدل وجان کرتا ہے

سراسر بے معنی اور بے حقیقت ہوجاتی ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جوازسر تاپا محض دھوکا فریب اورمایا ہے یاجس میں انسانی زندگی ایک بے مایہ شے تصور کی جاتی ہے اخلاقی کشمکش اورروحانی جدوجہد ایک بناوٹی اورمصنوعی جنگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتی کیونکہ ان کے قضایا کے مطابق حقیقت میں کوئی عمل واقع نہیں ہوتا اورجو واقع ہوتا نظر آتا ہے ۔وہ محض نظر آفرینی اورمایا کا نتیجہ ہے۔ ہماری حقیقت خود ایک سایہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے پس جس اخلاقی نصب العین کوتصوریا مطمع نظر کوہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی سایہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتا۔

پروفیسر ٹیلرسج[11] کہتا ہے کہ:

" جب ہم کائنات کے نظریہ سے فطرت کویامافوق الفطرت کوخارج کردیتے ہیں توہماری اخلاقی زندگی کا ستیاناس ہوجاتا ہے"

ہماری اخلاقی زندگی درحقیقت ہماری تمام اخلاقی کوششوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی پہلی منزل فطرت ہے اورآخری منزل خداہے۔ ہم زندہ خدا کو اپنی زندگی سے الگ کرکے یا اُس کوخارج

[11] Taylor, the Faith of Moralist, vol.i.p.124

کرکے یاحقیقی عالم شہود کودھوکا قرار دے کر اخلاقی کوشش اورروحانی ترقی نہیں کرسکتے۔

۴

ہندوفلسفہ میں بدی جہالت کی مترادف ہے اورنیکی گیان کی مترادف ہے۔ پس بدی روح کامرض نہیں بلکہ محض مایا ہے جوگیان کے ذریعہ دُورہوسکتی ہے۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن جی کہتے ہیں:

"سب سنسار تینوں گنوں سے بنی ہوئی چیزوں کی وجہ سے مجھ کو نہیں جان سکتے۔ اس مایا کوجوگنوں کی وجہ سے چھیدنا دشوار امر ہے لیکن صرف وہی جوایسا کرکے پار ہوجاتے ہیں۔ میرے پاس آسکتے ہیں لیکن بدکار وہ ہیں جن کی بُدھی ماری جاتی ہے۔ وہ میرے پاس نہیں آتے۔ کیونکہ مایا کا اثر اُن کی عقلوں پر ہوتا ہے اوروہ اُسور ہوتے ہیں۔(۷: ۱۳تا ۱۵)۔

" میرے نور سے جل اگیان کی تاریکی دورہوجاتی ہے(۱۰: ۱۱)۔

ویدانت کے نزدیک بدی اورجہالت ایک ہی شے ہے۔ اور دونوں بے حقیقت ہیں۔ اسلام میں بھی بدی اورنیکی دونوں کا وجود اللہ کے قادرارادہ کی وجہ سے ہے"۔ اللہ جس کوچاہتا ہے گمراہ کرتا ہے

اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۔ پس ان دونوں عقیدوں کے مطابق بدی ایسی دشمن نہیں جس کے ساتھ جنگ کرنا اورجس کو مغلوب کرنا انسان کا فرض اولین ہو۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کا اثر ہماری روحانی جدوجہد اورکشمکش پر پڑتا ہے ۔ کیونکہ انسان کا یہ اولین فرض نہیں رہتاکہ بدی کی طاقتوں کے ساتھ حتے الوسع جنگ کرے۔

۵

علاوہ ازیں اسلامی اورہندوعقیدوں کے مطابق بدی کا وجود اس دنیا سے نہیں مٹ سکتا۔ کیونکہ وہ ان عقائد کے مطابق لازمی شے ہے۔ چونکہ اسلام کا خدا نیکی اوربدی دونوں کا خالق ہے۔ لہذا بدی کے وجود کا دنیا سے اٹھ جانا ایک امر موہوم ہے۔ ہمہ اوستی عقیدہ کے مطابق نیکی اوربدی کا امتیازکرنا جہالت اورحماقت پر دال ہے کیونکہ ذاتِ مطلق کا وجود نیکی اوربدی دونوں میں ظہورپکڑتا ہے۔ چنانچہ بھاگوت دیتا میں کرشن کہتے ہیں " میں ہی دغابازوں کا مکر ہوں اورنیکوں کی نیکی ہوں"۔(۱۰: ۳۶)۔ اورسوامی دیویکانند کہتے ہیں " گناہ محض ایک دھوکا اورمایا ہے۔ جس کی درحقیقت کوئی ہستی نہیں۔ کسی انسان کوگنہگار کہنا سب سے بڑا گناہ ہے"۔

سمجھتا ہوں توداغ کو رند زاہد
مگررند اسکودلی جانتے ہیں

دریں صورتِ حالات اخلاقی کشمکش اوررُوحانی جنگ بے معنی الفاظ رہ جاتےہیں اوربدی کی طاقتوں سے جنگ کرکے اُن پر غالب آنا ایک فضول امر ہوجاتا ہے۔

۶

مندرجہ بالا نظریہ جات کے برعکس مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ بدی مایا اوردھوکا نہیں بلکہ ایک زبردست حقیقت ہے جوہم کو انسانی تعلقات کے ہرگوشہ میں ملتی ہے (رومیوں پہلا باب) ہم کو حکم ہے کہ " بدی سے نفرت رکھونیکی سے لپٹے رہو"(رومیوں ۱۲: ۹)۔ نیکی کے ذریعہ سے بدی پر غالب آؤ(رومیوں ۱۲: ۲۱)۔"کیونکہ جوبدی کرتا ہے وہ نورسے دشمنی رکھتا ہے"(یوحنا ۲: ۲۰)۔ پس بدی کی طاقتوں سے جنگ کرنا ہمارا مقدم فرض ہے(افسیوں ۶: ۱۱ وغیرہ)۔مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ بنی نوع انسان کی حالت کوسدھارنا اورخلقِ خدا کی خدمت کرنا انسان کی سعادتِ دارین کا باعث ہے(متی ۲۵باب)ہندومذہب اورفلسفہ جودنیا اورزمان ومکان کے تعلقات کومایا قراردیتا ہے وہ کس طرح اس

قابل ہوسکتا ہے کہ دنیا کی حالت کوسدھارسکے؟ دریں صورت کوئی صحیح العقل شخص ان دونوں اصولوں کوکس طرح یکساں قبول کرکے دونوں کو برابر طورپر صحیح مان سکتا ہے؟ مسیحیت ہم کو کہتی ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ زمان ومکان کی قیود کے اندر خدا کی بادشاہت کی آمد کے لئے راہ تیارکریں۔ یہ شرف مسیحیت ہی کوحاصل ہے کہ وہ تمام انسانی اعمال وافضال اورتمام دنیاوی تعلقات مثلاً مردوزن کے تعلقات والدین اوربچوں کے تعلقات حاکم ومحکوم کے تعلقات وغیرہ کو ابدی زندگی سے متعلق کرتی ہے اورہم کو تعلیم دیتی ہے کہ ان تعلقات کے ذریعہ ابدی زندگی اسی زندگی میں ہم کو ملتی ہے کیونکہ دنیاوی تعلقات روحانی زندگی کے حقیقی پہلو ہیں چنانچہ مقدس یوحنا کہتاکہ:

"جوکوئی راستبازی کے کام نہیں کرتا وہ خدا سے نہیں اوروہ بھی نہیں جو اپنے بھائی سے محبت نہیں رکھتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہوگئے ہیں۔کیونکہ ہم بھائیوں سے محبت رکھتے ہیں جو محبت نہیں رکھتا وہ موت کی حالت میں رہتا"۔(۱یوحنا۳باب)۔

۷

چونکہ ہندومت اورفلسفہ میں اخلاقی مساعی جمیلہ کے لئے جگہ نہیں اوراسلام کی تعلیم روحانی جدوجہد کی ممدومعاون نہیں ۔ لہذا یہ مذاہب ہندوستان کی حالت کو سدھارنہ سکے۔ سررادھا کرشن اورسر محمد اقبال مرحوم جیسے فلاسفر بہتیرا زور مارچکے لیکن ناکام رہے۔دورِ حاضرہ میں ہندوستان اورغیرممالک میں ہندومت اورفلسفہ پر کسی شخص کی کتابیں اس قدر مقبول عام نہیں ہوئیں جتنی سررادھا کرشن کی۔ آپ کی انگریزی کتب کا ترجمہ یورپ کی دیگر زبانوں میں بھی ہوگیا ہے۔ ان کتابوں میں آپ نے اپنی خداداد قابلیت کوکام میں لا کر ازحد کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندومت اورفلسفہ میں اخلاقی جدوجہد اورروحانی کشمکش کے لئے جگہ نکل آئے۔ لیکن آپ باوجود اس قدر لیاقت کے ناکام رہے کیونکہ جس مذہب اورفلسفہ کے آپ نام لیوا ہیں۔ اُس میں ازروئے عقل اخلاقی جدوجہد کے لئے جگہ ہے ہی نہیں۔ پس جائے تعجب نہیں کہ ہندو مذہب ہندوستان کی حالت کوسدھارنہیں سکا۔ اس کے فلسفہ کے اصول نے ہندوستان پر افیون کا اسا اثر ڈال رکھا ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ ہزاروں سالوں تک تاریخ زبانِ حال سے پکارپکارکر اس مذہب اورفلسفہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کررہی ہے۔ ہمارے ملک

کے کروڑوں اچھوت لاکھوں ہندو بیوائیں اوردیگر مظلوم اس مذہب اورفلسفہ کی تہید ستی کے زندہ گواہ ہیں۔ ہندوستان کے ملک اورقوم کی حالت کبھی بہتر نہیں ہوسکتی جب تک ہندومت اورفلسفہ اپنے کرم اورتناسخ کے عقیدوں کوترک نہ کریگا اوراپنی موجودہ دھندلی، مبہم اورغیر معین شکل بدل کر کوئی دوسری شکل اختیار نہ کریگا۔ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حالات مثلاً اچھوت کو اٹھانے وغیرہ میں اصلاح ناممکن ہے تاوقتیکہ ہندومت اپنے اصول کوترک نہ کرے۔ ہندوستان کے سوشل ریفارمر اورمصلحین ہمیشہ یہی شکایت کرتے رہے کہ ہندومت اورفلسفہ کے اصول ان کی اصلاحی کوششوں میں مداخلت کرتے ہیں۔ ذات پات کی امتیازقوم کی شیرازہ بندی نہیں کرنے دیتی۔ کرم اور تناسخ کے اُصول ہندوستان کی برائیوں مثلاً عورتوں کی پستی، ہندو بیواؤں کی قابل رحم حالت مظلوموں اوراچھوتوں وغیرہ وغیرہ کی ذمہ دارہیں۔ یہ درست ہے کہ دورِحاضرہ کے ہندومسیحی اُصول محبت اورمسیحی مبلغین کی خدمت ایثار نفسی سے متاثر ہوکر اُن کی حالت کوسدھارنے کی خواہشمند ہیں لیکن ہندو نظریہ کائنات کے طوق وسلاسل کے ثقیل وزن کی وجہ سے ان کی کوششیں بے سود ثابت ہورہی ہیں لیکن ہندوفلسفہ ان کی مساعی جمیلہ میں ممدومعاون نہیں ہے۔ حقوق العباد دراصل خدا کے تصور پر مبنی ہیں۔ ان مصلحین کوایک ایسے الہٰی تصور کی ضرورت ہے جو اُن کو اصلاح کی جانت تحریک وترغیب دے سکے۔ لیکن اس قسم کا الہٰی تصور ہندوفلسفہ اورہندومت میں کالنادرفی المعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ ایک بے حرکت اورساکن اورجامد ذاتِ مطلق کس طرح ان مصلحین کو رحم ومحبت ایثار وخدمت کی طرف راغب کرسکتی ہے؟ ہرگز نہیں ۔ ہندومت میں بہترین شخص وہ شمار کیا جاتا ہے جوہرقسم کے جذبات سے خالی ہو۔ چنانچہ بھاگوت گیتا میں کرشن کہتے ہیں کہ:

"سچا سنیاسی وہ ہے جومحبت اورنفرت دونوں سے خالی ہے۔ ایسا شخص نجات حاصل کرتا ہے"(۵: ۳) سنیاسی نروان حاصل کرتا ہے (یعنی اسی شخص کی ذاتِ مطلق میں فنا ہوجاتی ہے)۔ جوعرفان حاصل کرکے خواہش اورجذبات سے خالی ہوجاتا ہے"(۵: ۲۶)۔ جواپنے حواس اورمن اوربُدھی کوقابو میں رکھ کر مکتی کا طالب ہوتا ہے۔ اورہمیشہ کے لئے خواہش خوف اورجذبہ کو مار ڈالتا ہے وہ مکتی پاتا ہے"(۵: ۲۸)۔ جودووان ہوتے ہیں وہ نہ کسی زندہ شخص کے لئے غم کھاتے ہیں اورنہ کسی مُردے پر افسوس کرتے

ہیں(۲: ۱۱)۔ کامل دوان وہ ہے جو نہ خوشی کے وقت خوشنوی کرتا ہے اورنہ دکھ میں پریشان ہوتا ہے۔ وہ خوف اورغصہ اورمحبت کے جذبات سے خالی ہوتا ہے وہ ہرامر میں بغیرکسی شے سے محبت کئے زندگی بسر کرتا ہے اوروہ نہ کسی شے کو پسند کرتا ہے اورنہ ناپسند کرتا ہے"(۲: ۵۶)۔ اس شخص کومکتی پراپت ہوتی ہے جوبغیر کسی جذبہ کے اس کرم کوجواس کا دھرم ہے کرتا ہے"(۳: ۱۹)۔ وہ جو نہ افسوس کرتا ہے نہ خواہش کرتا ہے نہ شاد ہوتا ہے نہ ناشاد ہوتا ہے۔ وہ جونیکی اوربدی دونوں کو چھوڑدیتا ہے ایسا شخص میرا پیارا بھگت ہے"(۱۲: ۱۷)۔

لیکن زندگی آرزو کا نام ہے۔ ہندوفلسفہ کا تعلق صرف نروان کے ساتھ ہے۔موجودہ زندگی اوراس کے لواحق سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔لیکن

خلوت کی گھڑی گذری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کی ہے بجلی سے آغوش سحاب آخر

ہندو عقائد کی وجہ سے مسٹر ڈیسائی جیسا سیاست دان کہتا ہے کہ" مذہب کا تعلق خدا اورانسان کے ساتھ ہے۔ اس کا واسطہ انسانی تعلقات کے ساتھ نہیں ہوتا ۔ یہ فقرہ ظاہرکرتا ہے کہ ہندونظریہ کی وجہ سے مسٹر ڈیسائی اس بات سے (جس کو مسیحی کلیسیا کا بچہ بچہ جانتا ہے) ناواقف ہیں کہ مذہب نج کا معاملہ نہیں اوراس کا تعلق نہ صرف خدا اورانسان کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ اس رشتہ کا اصلی ظہورترقی تمدنی معاشرتی اقتصادی سیاسی اوردیگر انسانی تعلقات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انجیل جلیل میں وارد ہوا ہے۔

" اگرکوئی کہے کہ میں خدا سے محبت رکھتاہوں اوروہ اپنے بھائی سے عداوت رکھے توجھوٹاہے۔ ہم کو مسیح کی طرف سے یہ حکم ملاہے کہ جوکوئی خدا سے محبت رکھتاہے وہ اپنے بھائی سے محبت رکھے(۱یوحنا ۴: ۲۰۔ ۳: ۱۷ وغیرہ)۔

ہمارے خدااورباپ کے نزدیک خالص اوربے عیب دینداری یہ ہے کہ یتیموں اوربیوہ عورتوں کی مصیبت کے وقت خبرلیں اور اپنے آپ کو دنیا سےبے داغ رکھیں(یعقوب ۱: ۲۷)۔

"جومجھ کو اے خداوند اے خداوند کہتےہیں ان میں سے ہرایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا۔ مگروہی جومیرے آسمانی باپ کی مرضی پرچلتاہے(متی ۷: ۲۱)۔

جب سیدنا مسیح اپنے جلال میں آکر قوموں کی عدالت کریں گے تووہ بعض کوبولیں گے کہ :

" آؤ میرے پروردگار کے مبارک لوگو جو بادشاہی بنائی عالم سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے اسے میراث میں لے لو۔کیونکہ میں بھوکا تھا ،

تم نے مجھے کھاناکھلایا ، میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا، میں پردیسی تھا، تم نے مجھے اپنے گھر میں اتارا ۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا ، بیمار تھا تم نے میری خبر لی ، قیدمیں تھا ، تم میرے پاس آئے ، تب دیانتدار جواب میں اس سے کہیں اے مولا ہم نے کب آپ کو بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا، پیاسا دیکھ کر پانی پلایا؟ ہم نے کب آپ کو پردیسی دیکھ کر گھر میں اتارا ؟ یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟ ہم کب آپ کو بیمار دیکھ کر آپ کے پاس آئے ؟ بادشاہ جواب میں ان سے فرمائے گا میں تم سے سچ کہتا ہوں جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی کےساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا۔

مذکورہ بالا چند اقتباسات سے ظاہرہے کہ ہندوازم کے برعکس مسیحی اصول کے مطابق مذہب اُس رشتہ سے مترادف نہیں جوخدا اور انسان کے درمیان ہے۔ بلکہ مذہب اُس رشتہ کو اُن دنیاوی تعلقات میں دیکھنا چاہتاہے جو مختلف انسانوں میں موجود ہیں۔ تمام ادیانِ عالم میں مسیحیت ہی ایک واحد مذہب ہے جوذاتِ الہٰی اورانسانی تعلقات کے تصورات اس قسم کے پیش کرتاہے کہ جومسیحیوں کو اس بات پر مجبور کردیتے ہیں کہ مظلوموں زیردستوں لاچاروں اورمصیبت زدوں کی مدد کریں کیونکہ اُن کا خدا محبت کا زندہ خدا ہے۔ مسیحیت ہندومت کی طرح کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ انجیل یعنی خوشی کی خبر ہے۔ اورہرکس وناکس کے لئے بشارت کا پیغام ہے۔

سب سے بڑا معیارجس سے ہم مذاہبِ عالم کوجانچ سکتے ہیں یہ ہے کہ ان کی نشوونما اورترقی اورتاریخ نے دنیا پرکیا اثرڈالا۔ کسی زندہ مذہب کے اصول کے عملی پہلوؤں کی پڑتال اس سے ہوسکتی ہے کہ اس نے اپنے مقلدین میں کس قسم کی زندگی جاری کی۔ کیونکہ ایمان کا نتیجہ عمل ہے اورمذہب کی علتِ غائی یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسی طبعیت طینت کیریکٹر اورخصلت نمودارہوجائے جس کی وجہ سے بنی نوع انسان سے ایسے اعمال سرزدہوں جن سے دنیا کی کایا پلٹ جائے۔ کیا ہندومت اورفلسفہ سے یہ کام ہوسکتا ہے؟ تاریخ ہند اس بات کا ببانگ دہل انکارکرتی ہے۔ ہم نے اپنی کتاب دینِ فطرت میں ثابت کیا ہے کہ اسلام اس مبارک کام کے کرنے سے قاصر رہا۔ کامیابی کا سہرا صرف مسیحیت کے سرپر ہے۔ پھر کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ تمام مذاہب برابراوریکساں ہیں؟

باب سوم

مذہبی رواداری اورقوم کی شیرازہ بندی

ہندوستان کے مذاہب اورفرقہ وارانہ ہنیت

گذشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا تھاکہ اہلِ ہنود اپنے مذہب کے غیر معین اُصول اورفلسفہ کی وجہ سے اس بات کے قائل ہیں کہ تمام مذاہب یکساں طورپر اپنی اپنی جگہ برحق ہیں اورکسی ایک مذہب کودوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ دورِحاضرہ میں قوم کی شیرزاہ بندی کومدنظر رکھ کر ہمارے لیڈر ہم کو یہی سبق سکھانا چاہتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں طورپر برحق ہیں اورتمام مذاہب کے بانی یکساں طورپر قابلِ تعظیم ہستیاں ہیں۔ اورمذہبی رواداری کا یہ سبق اس غرض سے سکھایا جاتاہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں ملتوں اورجماعتوں کی شیرازہ بندی ہو جائے اورہندوستان ایک قوم بن جائے۔

۱

یہ صورت حالاتِ زمانہ حال کے سیاسی وا ۃعات کی وجہ سے رونما ہوئی ہے۔ انگلستان ہندوستان پر حکمران ہے۔ اوراس نے ہندوستان کو ان کے فرقوں کے تناسب کے لحاظ سے حقوق دئیے ہیں ۔ پس اس کمیونل اورآرڈیا فرقہ وارانہ تناسب کی وجہ سے ہندی سیاسیات نے فرقہ وارانہ صورت اختیارکرلی ہے۔ اس اوآرڈ کی رُو سے صرف ایک مذہب کی بناء پر ہی کوئی جماعت اپنے دنیاوی اقتصادی اورسیاسی حقوق کی حفاظت کرسکتی ہے۔ پس عہدحاضر میں ہندوستان فرقہ وارانہ جنگوں کی جولان گاہ بنا ہواہے۔ وہ ملک جس کو کبھی جنت نشاں کہا جاتا تھا ان جنگوں اورلڑائیوں کی وجہ سے دوزخ کانمونہ بنا ہواہے۔ ہندو اورمسلمان ، سکھ اورعیسائی ایک دوسرے کوشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اورجب دلوں میں شک ہوتاہے تو باہمی محبت رخصت ہوجاتی ہے اورصلح اورآشتی کی بجائے دشمنی اورعداوت کا دور دورہ ہوجاتاہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک اورقوم کی باگ ڈورایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو نفاق کی آگ کو بجھانے کی بجائے اس کو تیزکرنا چاہتے ہیں ۔کیونکہ ان کو اپنے ذاتی اغراض اورملی مقاصد پر قومی مفاد کوقربان کرنے میں ذرا باک نہیں ہے۔ یہ دشمنانِ دین مذہب کی آڑکو خلق الله سے ایسی حرکتیں کرواتے ہیں جواُن کے مذہب کی بدنامی کا باعث ہوتی ہیں

کیونکہ درحقیقت ان کو خدا اورمذہب کا پاس نہیں ہوتا ۔ بالفاظ انجیل جلیل ۔

" اُن کا خدا اُن کا پیٹ ہے،وہ دنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں وہ خدا کی نسبت عیش وعشرت کوزیادہ دوست رکھتے ہیں اوردینداری کی وضع رکھ کر چکنی چپڑی باتوں سے سادہ لوحوں کو بہکاتے ہیں" (رومیوں ۱۶: ۱۸۔ فلپیوں ۳: ۱۹۔ ۲تمطاؤس ۳: ۴)۔

جس کا نتیجہ یہ ہوتاہے کہ مختلف مذاہب کے پیرو بمصداق

ایمان برائے طاعت ومذہب برائے جنگ

فرقہ وارانہ فسادات کوبرپا کرنے کی تاڑمیں رہتے ہیں اوراپنے اپنے فرقہ کے لئے حقوق حاصل کرنے کی خاطر باہمی پرخاش اورجدل کے مو بعہ کوہاتھ سے جانے نہیں دیتے اورشب وروزآتشِ عداوت کوتیز کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

کولٹن (Colton) نے کسی جگہ ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے کہ:

"لوگ مذہب کی خاطر دھواں دھارتقریریں کرتے اوربے شمار کتابیں لکھتے ہیں: وہ اُس کی خاطر جنگ وجدل کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مطابق زندگیاں بسر نہیں کرتے :

اخبار سٹیٹسمین کے ایڈیٹر مسٹر آرتھر موروودرست کہتے ہیں کہ:

" ہندوستان کے مذہبی اختلافات کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر مذہب کا احساس موجود نہیں ہے۔ہم خدا کی خاطر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں کیونکہ ہم میں خدا کا علم موجود نہیں۔ہم خدا کی خاطر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ کیونکہ ہم میں خدا کا علم موجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتاہے کہ خالق اوراس کی خلقت کے درمیان جودروازہ ہے وہ بند ہو گیا ہے۔ ہندوستان اوردنیا کوایک نئے پیشوا اورہادی کی ضرورت ہے جس نے خدا کودیکھا ہے۔ تاکہ وہ نوع انسانی کو طمع اورلالچ سے نجات دے اوراس کو ترقی کی راہ پر چلائے "(ٹربیون ۲۶ فروری ۱۹۴۰ء)۔

۲

ہرذوقِ سلیم رکھنے والے شخص کی طبیعت آئے دن کی مذہبی جنگوں اورفرقہ وارانہ لڑآئیوں کی وجہ سے قدرتاً متنفر ہوجاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگیا ہے کہ سلیم طبائع پر مذہب کو وہ اقتدار حاصل نہیں رہا جواس صدی کے آغازمیں تھا۔ بالخصوص صحیح مذاق کے نوجوانوں کا طبقہ مذہب کے نام سے بیزارنظر آتا ہے۔ جرمن فلاسفر شلائر میخر (Sacheier Macher) نے خوب کہا ہے کہ:

"بالعموم ایک پشت اپنے سے پہلی پشت کی غلطیوں کو ایک اورغلطی کرنے سے درست کرتی ہے"۔

گذشتہ پشت مذہب کی اس قدر دلدادہ تھی کہ ہر وقت دعا نماز گیان دھیان میں مصروف دنیاوی ترقی سے بے خبر تھی۔ موجودہ پشت نے اس غفلت شعاری کو یوں درست کیا ہے کہ مذہب اوردین اورخدا کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اس معاملہ میں نوجوان طبقہ ملک روس کی پیروی کرکے مذہب کو زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس طبقہ کا اگرکوئی مذہب ہے تووہ قوم پرستی اوروطن پرستی ہے اوریہ مذہب ایک جارحانہ صورت اختیارکررہا ہے جس کانتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی نظر میں مذہبی اُصول کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی ہیں اوربالفاظِ مسٹرگاندھی :

" سیاسیات کے اژدہا نے ہندوستان کواپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے"۔

ہندوستانی قوم کا اُس دن خاتمہ سمجھو جس روز بدخدا اور مذہب کے لئے اس ملک میں جگہ نہ رہی ۔ ہمارے نوجوان خدا کو بھول گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے پرستش کرنی نہیں چھوڑی کیونکہ پرستش انسانی فطرت کی طبعیت میں داخل ہے۔ لہذا وہ سچے خدا کی بجائے جھوٹے معبودوں کی پرستش کررہے ہیں۔ اوریہ جھوٹے معبود اُن کے خود ساختہ نظرئیے ہیں۔ بُت پرست کا معبود اس کا خود ساختہ بُت ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے نوجوان پتھر، چاندی یاسونے وغیرہ کے بتوں سے بیزارہوکر ہاتھ کے بنائے ہوئے بُتوں کی بجائے دماغوں کے بنائے ہوئے بُتوں کے آگے سربسجود ہیں۔ پس قومیت اوروطن پرستی نے مذہب اورخدا پرستی کی جگہ غضب کرلی ہے اور قوم کے تصورنے ہندوستانیوں کے دلوں پر وہ اقتدارحاصل کرلیا ہے جوکسی زمانہ میں خدا کے تصورکوحاصل تھا۔ آج کل جس کودیکھو وہی قوم اوروطن پر فدا ہے۔قومیت یاوطنیت بجائے خودایک مستقل مذہب ہوگیا ہے ۔ چنانچہ مشہوربنگالی لیڈرآربندوگھوش کہتا ہے کہ:

"قومیت ایک ایسا مذہب ہے جوخدا کی طرف سے ہے۔ قومیت مرنہیں سکتی کیونکہ خدا مرنہیں سکتا۔ خدا جیل خانہ میں بھیجا نہیں جاسکتا"۔

یوں قومیت کے زہریلے جراثیم ہماری زندگی کے ہرشعبہ میں سرایت کرگئے ہیں خواہ وہ شعبہ اقتصادیات سے متعلق ہویاعلم ادب سے خواہ وہ سیاسیات سے اورخواہ مذہب سے متعلق ہو۔ غرضیکہ

تمام امورِ زندگی کوقومیت کی کسوٹی اورمعیار سے پرکھا جاتا ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ:

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے جس طرح میں جادوٹوٹکے، پر یقین نہیں رکھتا ۔اسی طرح میں مذہب کوبھی نہیں مانتا اورنہ اُس میں کوئی فائدہ دیکھ سکتاہوں"۔

اورہندوستان کے ہرگوشتہ سے ہمارے نوجوان آمنا وصدقناً پکارا ٹھتے ہیں۔ کیونکہ قومیت اوروطنیت کا جذبہ اُن میں جوش زن ہے۔ ہمارے ان نوجوانوں کوسکولوں اورکالجوں میں دینی تعلیم نہیں ملتی جس کا نتیجہ یہ ہوگیاہے کہ ان کی مذہبی حس میں حرکت نہیں رہی۔ اوروہ خدا اورمذہب کی اہمیت کے منکر ہوگئے ہیں۔ اس کا اثر ان کی خوادرخصلت پر پڑگیا ہے اوراب وہ دورِحاضرہ میں جس کو دیکھو وہی روتا ہے کہ نئی پود میں ضبط اورذمہ داری کا احساس نہیں رہا!!

ہم محبِ وطن کا نصب العین یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ چونکہ بظاہر مذہب اس شیرازہ بندی کی راہ میں ہے لہذا دوقسم کے خیالات پیدا ہوگئے ہیں ۔ پہلی قسم کے لوگ مذہب سے اس قدر متنفر ہوگئے ہیں کہ وہ مذہب کا قلع قمع کردینا چاہتے ہیں ۔ وہ رُوس کی نظیر پیش کرکے کہتے ہیں کہ جب سے روس مذہب کی قید سے آزاد ہوا ہے۔ وہ ترقی کی دوڑمیں بیش ازبیش ہے اور ہندوستان بھی کبھی ترقی نہیں کرے گا۔جب تک خدا اورمذہب ملک بدرنہ کیا جائیگا۔ گویا خدا کو ہندوستان سے نکال کر ہندوستانی قوم ترقی کرسکتی ہے!

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جواس حد تک جانا نہیں چاہتے پس یہ قومی لیڈرفرقہ وارانہ فسادات کومٹانے کے لئے کہتے ہیں کہ ان فسادات کی اصل جڑ فرقہ وارانہ تناسب ہے۔ جوبرطانیہ نے آمرانہ حیثیت سے کیا ہے۔ جب کسی فرقہ کی تعداد میں اضافہ ہوجاتاہے تواس تناسب کی وجہ سے اس کو زیادہ اقتصادی اورسیاسی حقوق مل جاتے ہیں۔ پس کسی مذہب کویہ اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ کہ وہ اپنی جماعت کو تبلیغ وتحریص کے ذریعہ بڑھاسکے۔ یہ صورت تب پیدا ہوسکتی ہے جب ہم یہ مان لیں کہ کسی مذہب کودوسرے مذہب پر فوقیت حاصل نہیں اوریہ اصول تب ہی ماناجاسکتا ہے جب ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ تمام مذاہب برابر ہیں اورکسی ایک مذہب کے اصول دوسرے سے اعلیٰ یاادنیٰ نہیں ۔ پس اس بات کا ہرممکن طورپر پراپیگنڈہ کیا جاتاہے کہ مذاہب کی تمیز وتفریق

کویکسر بھول جانا چاہیے ۔ تاکہ ہندوستانی قوم کی شیرازہ بندی ہوسکے۔ اورہمارا نصب العین یہ ہوکہ تمام ہندوستانی بلاتمیز رنگ، نسل ، ذات فرقہ اورمذہب ایک قوم بن جائیں اوراس مقصد کو پورا کرنے کے لئے تمام مذاہب کوچاہیے کہ اس بات پر متفق ہوجائیں کہ تمام مذاہب یکساں طورپر حق ہیں اورچونکہ وہ برابر ہیں لہذا کسی ایک مذہب کودوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔پس کسی مذہب کا معتقد اس بات کا مجازنہیں ہوگاکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کویہ دعوت دے کہ تم اپنا مذہب ترک کرکے میرا مذہب قبول کرلو اورنہ کسی شخص کویہ حق حاصل ہوگاکہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرکے دوسروں کو اُس کا حلقہ بگوش کرے۔ اوراگرکوئی شخص اس قسم کی جرات کرے گا تووہ قوم کا غدار تصورکیا جائے گا اورملک کے قوانین کی رُو سے مجرم گردانا جائے گا۔

۲

لیکن اگراس ایک حقیقت پر کل مذاہب کا اتفاق ہے کہ
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

تویہ امرظاہر ہے کہ مذہب بذاتِ خود ہندوستانی قومیت کی شیرازہ بندی کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ بلکہ فرقہ وارانہ فسادات کی اصلی جڑ فرقہ وارانہ تناسب ہے یہ ایک طوق ہے جوبرطانیہ نے ملک ہندوستان کے گلے میں ڈال دیا ہے۔ پس لازم تویہ ہے کہ اس فرقہ وارانہ تناسب کو مٹانے کی کوشش کی جائے تاکہ کسی مذہب وفرقہ کی تعداد کے بڑھنے یا کم ہونے سے اس کے اقتصادی اورسیاسی اقتدارمیں سرموفرق نہ آئے لیکن یہاں الٹی گنگا بہ رہی ہے۔ اس کی بجائے کہ کانگریس اس تناسب کونابود کرنے کی کوشش کرتی سارا زور اس بات پر لگایا جاتا ہے کہ مذاہب کی تبلیغی مساعی کونیست ونابود کردیا جائے۔ اورہم کو الٹی منطق یہ پڑھائی جاتی ہے کہ تمام مذاہب برابر ہیں۔

۳

ان قومی لیڈروں کے زعم میں مذہب کی ملکی اورقومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہے اورمذہب کے وجود کی وجہ ہی سے ہمارے ملک میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ پس یہ لیڈر قومی تنظیم اورفرقہ وارانہ جنگوں کومٹانے کی خاطر ہم کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ مذہب کا تعلق خدا سے ہے اوراس کوسیاسیات میں دخل دینا نہیں چاہیئے۔ چنانچہ گذشتہ باب میں ہم مسٹر ڈیسائی کا قول نقل کرکے اس کی بطالت کو واضح بھی کرچکے ہیں۔ یہ

بات غلط ہے کہ مذہب کا دنیاوی تعلقات اور معاشرتی تمدنی اقتصادی اورسیاسی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا یہ اصحاب مذہب کی غرض وغایت سے ناواقف ہیں اگر مذہب کا انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں تودیندار شخص وہ ہوگا جوتارک الدنیا ہوجائے اوربیوی کوطلاق بچوں کو عاق اورسوسائٹی کوچھوڑ چھاڑالگ ہوجائے۔حق تویہ ہے کہ جب تک مذہب دنیاوی تعلقات کے ساتھ واسطہ نہ رکھے گا وہ اپنی علتِ غائی کوفوت کردیگا۔ قومیت وطنیت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے۔ اس لئے وہ انسان کی سیاسی معاشرتی اوراقتصادی زندگی پر اثر اندازنہیں ہوسکتا۔ لیکن مذہب محض ایک اخلاقی نصب العین ہی نہیں بلکہ وہ مکمل دستورحیات ہونا چاہیے۔ مذہب کا کام بنی آدم کوصرف عقائد مذہبی کی ہی تلقین کرتا نہیں۔ بلکہ اس کے اصول نظامِ معاشرت پر بھی حاوی ہوتے ہیں۔ لہذا انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے ہمہ گیر اقتدار سے آزاد نہیں ہوسکتا۔کوئی مذہبی شخص اپنی زندگی کو دویا اسے زیادہ طبقوں میں منقسم نہیں کرسکتا ایساکہ ایک طبقہ مذہب کے زیر اثر ہو اوردیگر طبقے کسی دوسرے دستور العمل کے ماتحت ہوں۔بالخصوص مسیحیت نے زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت قرار دے دیا ہوا ہے ۔ خدا کی عبادت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان خلق خدا کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو۔ بالخصوص مسیحیت کے اصول ہی ایسے ہیں کہ جب تک ان کا اطلاق انسانی تعلقات پر نہ کیا جائے وہ بے معنی رہینگے۔اب کون شخص ایسا دیدہ دلیر ہوگا جویہ دعویٰ کرے کہ الہٰی ابوت اورانسانی اُخوت ومساوات کے اُصول کا اطلاق ہندوستان کے تمدنی اقتصادی اورسیاسی معاملات پر نہیں کرنا چاہیے۔یہ ظاہر ہے کہ اگر ان اصولوں کااطلاق دنیاوی تعلقات پر کیا جائے توہندوستان میں ایک سنہری دورشروع ہوجائیگا۔ اورمسیحیت کا تودعویٰ ہی یہ ہے کہ اس کے اصول پر عمل کرنے سے دنیا کی کایا پلٹ جاتی ہے اوروہ ازسرنو ایک نئی دنیا بن سکتی ہے۔ اس کی صداقت کا معیارہی یہ رہا ہے کہ اس نے ہرزمانہ قوم اورملک کی کایا پلٹ دی ہے اورتاریخِ عالم اس دعویٰ کی صداقت پر اپنی مہرثبت کرتی ہے۔

قومیت اوررواداری

ہمارے قومی اورسیاسی لیڈرراواداری کا سبق ہم کو سکھاتے ہیں تاکہ موجودہ فرقہ وارانہ فضا صاف ہوجائے۔وہ مختلف

مذاہب کے پیشواؤں کو کہتے ہیں کہ تم ایمانیات کے بارے میں محتاط رہو اوراس اُن عقائد کاذکر زبان پر مت لاؤ جواختلافی مسائل ہیں کیونکہ اس طرح مختلف مذہبوں اورفرقوں اورجماعتوں میں اختلاف کی خلیج بڑھتی چلی جاتی ہے اورقوم کی شیرازہ بندی نہیں ہوسکتی۔اگرتم چاہتے ہو کہ ہندوستانی قوم ایک واحد قوم بن جائے تو اُن عقائد کا ذکر کیا کروجوتمام مذاہب میں مشترکہ عقائد ہیں۔ کیونکہ مختلف فیہ مسائل کاذکر کرنا باہمی مخاصمت اوردشمنی کو بڑھائیگا اورمشترکہ عقائد کا ذکرکرنے سے دوستی اتحاد اوریگانگت کا رابطہ قائم ہوگا۔

چنانچہ مشہور بُدھ معلم ڈاکٹر پی کلاراٹنے(Kularatne) نے جوکولمبو کے انند کالج کے پرنسپل ہیں۔ گذشتہ سال جمعیت المذاہب عالم (World Congress of Faiths) کے اجلاس میں جو کیمبرج میں منعقدہوا تھا دورانِ تقریر میں فرمایا:

" مختلف مذاہب والوں کوچاہیے کہ اہم اورغیراہم اختلافی مسائل پر بحث نہ کیا کریں۔ اس کی بجائے ان کو اس بات کا تیہہ کرلینا چاہیے ۔ کہ مشترکہ عقائد کا تذکرہ اوراقرار کیا کریں"کافر" وغیرہ الفاظ کا استعمال یک قلم بند کردینا چاہیے اورایک دوسرے کو مختلف ناموں سے نہیں پکارنا چاہیے ۔ ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم اپنی جماعتوں کے نومریدوں کی مردم شماری بڑھاتے نہ رہیں"۔

علاوہ ازیں ہمارے لیڈر ہم کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ جواختلافی مسائل ہیں وہ محض عارضی اورغیر ضروری ہیں اورمشترکہ عقائد اصلی بنیادی اورلازمی اورضروری عقائد ہیں۔پس ہم کوچاہیئے کہ مقابلہ مذاہب میں عارضی اورغیرضروری باتوں کا ذکر چھوڑکر اصلی اوربنیادی باتوں کا ذکر کریں تاکہ تمام مذاہب کے پیرو صلح اور اتفاق کی جانب مائل ہوں اورہندوستان ایک قوم ہوجائے۔وہ آئے دن یہ بھی پرچارکیاکرتے ہیں کہ اختلافی مسائل کا ذکر چھیڑنا عبث ہے کیونکہ روزمرہ زندگی کی عملی ضروریات کا ان اُمور سے تعلق نہیں پس ان کوکوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ مسائل کے اختلاف پر بحث کرنا ناحق کی سردردی مول لینا ہے۔بس اللہ کومانو اورنیک عمل کرویہ کافی ہے۔ ہندو"مسلم" مسیحی" کی تمیزکو مٹادو کیونکہ ان اختلافات کے قائم رہنے سے قوم کی سیاسیات پر اثرپڑتا ہے۔ چنانچہ مسٹرڈیسائی نے ایک لیکچر کے دوران میں کہا:

" جس روز ہندوستان کے باشندے اپنے آپ کو ہندو" مسلم" کے نام سے موسوم کرنا بند کردینگے اس روز ہندوستان آزاد ہوجائیگا"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ **۲۹** فروری **۱۹۳۶**)۔

ہمارے مخاطب کہتے ہیں ۔ بس خدا کو مانو اور باقی جھگڑے چکادو۔ لیکن کیا یہ بات سچ ہے کہ تمام مذاہب خدا کی ہستی کومانتے ہیں ؟ کیا ہندو مذہب میں بعض فرقے ایسے نہیں جوسرے سے خدا کے قائل ہی نہیں؟ کیادہریت کا نام صفحہ ہستی سے مٹ گیا ہے؟ دُور کیوں جاؤ خودہمارے ملک ہندوستان میں ہزاروں خدا کے بندے ایسے موجود ہیں جوہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہمنوا ہوکر کہتے ہیں کہ اگرہندوستان سے خدا کونکال پائے توآج اتحاد ہوسکتا ہے۔ پس واجب تویہ ہے کہ مذہبی رواداری خامی لگے ہاتھوں اس بات پر اصرارکریں کہ مختلف مذاہب کا یہ فرض ہے کہ خدا کا انکارکریں تاکہ ہندوستان کی قوم شیرازہ بندی ہوسکے!

رہنے دے جھگڑے کویارتوباقی
رُکے نہ ہاتھ ابھی رہے گ گلو باقی

ہمارے قومی لیڈرمذہبی رواداری کا سبق دیتے وقت ہم کو اس ابت کی تلقین کرتے ہیں کہ قومی ضروریات کومدنظر رکھ کر ہم کسی مذہب چینی نہ کریں۔ کیونکہ اس طرزِعمل سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی ہے طرفین کے جذبات مجروح ہوکر برانگیختہ ہوجاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ سے فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ جوقومی اتحاد میں سدہ راہ ہوتےہیں۔

۲

جب ہم ان قومی رہنماؤں کی تقریروں اورتحریوں کوغور سے دیکھتے ہیں توہم پریہ ظاہرہوجاتاہے کہ مذاہب کورواداری کاسبق مذہب کی خاطر بلکہ قومیت کی خاطر دیا جاتاہے اورسبق دینے والوں نے نہ مذاہب کو دفعہ کیا ہے اورنہ ہی وہ مذہبی اختلافات کی اہمیت سے واقف ہونے سے گوارا کرتےہیں۔ یہ اصحاب مذہبی اورامور میں فکر غورتجسس اور سے .عطاً بے نیاز ہوتے ہیں اوررواداری کے حامی بن کر مبلغین پردفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کرکے عامتہ الناس سے خراج تحسین وصول ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ جس طرح دیگر بے سروپا مبہم اوربےمعنی الفاظ خلائق ہوتے ہیں۔ اسی طرح مذہبی رواداری کا لفظ بھی ہمارے ہی لیڈروقت اوربے مو.عہ اورمحل دیکھے بغیر طوطے کی طرح سنادیتے ہیں۔ لیکن اُن کے اذہان میں اس کا کوئی خاص معتین مفہوم نہیں ہوتا۔کیونکہ وہ رواداری کے اصل مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ تقریروں اورتحریروں سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان کوغوروفکر کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔وہ خیال کرتے

ہیں کہ لیڈر وہ شخص ہوتا ہے۔جو غوغاآرائی کرسکے اوروقت بے
وقت جا اوربے جا اپنے مخالفوں کے خلاف اخبارات اورپلیٹ فارم پر
سے دھواں دھارتقریریں اورعامیانہ حملے کرتا رہے۔ وہ عوام الناس
کوخوش کرنے کے لئے اُن کی سی بات کہہ دیتے ہیں اوراپنی ضمیر پر
چلنے والے بااصول آدمیوں کے بے باکانہ پائمال کردیتے ہیں تاکہ اُن
کی لیڈری میں کسی قسم کے خلل کا احتمال پیدا نہ ہو۔

معشوق مابمذہب ہرکس برابر است
باماشراب خورد وبزاد نماز نہ کرو

ایسے لیڈرو کی عبرت کی خاطر ہم یہاں مرحوم لارڈ مارلے کی
کتاب" رواداری" کی عبارت نقل کرتے ہیں تاکہ وہ ان پرغور کرکے
اپنے زوایہ نگاہ کوبدل سکیں۔ لارڈ مرحوم فرماتے ہیں[12]:

جُوں جُوں سیاسی ذمہ داری بڑھتی گئی ہے ہماری دماغی ذمہ
داری کم ہوتی گئی ہے۔ لیکن سوسائٹی کی بہبودی اسی میں ہے کہ یہ
خلیج بڑھنے نہ پائے۔ اگرسیاسیات ہماری زندگی پر غالب ہوگی
توہماری وسیع النظری جاتی رہیگی۔ اورصرف وہی باتیں ہماری
دلچسپی کا موجب ہوں گی جن کا ہماری مادی خوشحالی کے ساتھ
براہ راست تعلق ہوگا۔ باقی متام اُموریا نظر انداز ہوجائینگے یاادنیٰ
درجے کے متصور ہونگے۔ اس کانتیجہ یہ ہوگاکہ قوم کے افراداُن اثرات
سے الگ رہینگے جودرحقیقت قوم کو سب سے زیادہ تقویت پہنچاتے
ہیں اورخیالات کووسعت اوررفعت بخشتے ہیں اورعالی دماغ انسان
پیدا کرتے ہیں۔اول: وہ ان متام زبردست اوروسیع مسائل کی طرف
سے لاپروائی اختیارکرلیتے ہیں۔ جن کی جانب انسان ہمیشہ متوجہ رہا
ہے ۔ دوم۔ اُن میں یہ خواہش نہیں رہتی کہ ہرچہ باداباد ہم دلیرانہ
اُن مسائل کے جواب کی تلاش میں لگے رہینگے ۔ اوراگرہم کوکوئی یقینی
جواب نہ ملا۔ توکم ازکم ہم کو یہ تسلی توہوگی کہ ہم نے اپنی طرف
سے کوئی کسراٹھا نہ رکھی۔ عوام الناس تواس قسم کے مسائل کی پرواہ
بھی نہیں کرتے لیکن افسوس تویہ ہے کہ اس زمرہ میں نہ صرف عوام
الناس ہی داخل ہیں بلکہ ایسے اشخاص بھی پالے جاتے ہیں جوان
مسائل کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں لیکن ان کے دماغوں پر
سیاسیات اس قدرمسلط ہوتی ہے کہ اُن کویہ خدشہ ہروقت دامن
گیررہتا ہے کہ اگراُنہوں نے ان مسائل پرآزدانہ بحث کی تواُن کے حق
میں اس کا نتیجہ کہیں مضر ثابت نہ ہو۔پس وہ اس بحث کے نزدیک
نہیں پھٹکتے اوران اہم اُمورکے متعلق رائے قائم کرنے سے کوسوں

12 John Morley, on Compromise ,chapter 3

دوربھاگتے ہیں۔ اُن کو یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ اگراُنھوں نے کوئی رائے قائم کردی ہے جواُن کے خیال میں راست ہوگی تووہ لوگوں کی نظروں سے اُترجائینگے اوران پروہی مثل صادق آئیگی کہ کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔ایسے لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کوتاہ ہے۔ مبلغین کی جماعت میں شامل ہونا اُن کے مرغوب خاطر نہیں ہوتا۔ شہداء کی جماعت میں وہ داخل ہونا نہیں چاہتے۔ نہ وہ لہولگاکر شہیدوں میں شمارہونا چاہتے ہیں ۔ پس وہ کہتے ہیں کہ نہ ان باتوں پر متوجہ ہو اورنہ اپنی جان کو ہلکان کرو۔ بس نہ کوئی رائے قائم اورنہ اُس رائے کوظاہر کرو۔ ایسے طریقہ کار سے دنیا میں صلح اورآدمیوں میں رضامندی قائم ہوگی۔

اگراس طریقہ کارکا کوئی اورضررسا ں نتیجہ نہیں ہوتا توکم ازکم یہ ضرورہوتا ہے کہ ہماری ذمہ داری کا احساس کمزورہوجاتا ہے۔ یہ احساس پہلے تیزکانٹے کی طرح ہم کو چبھتا تھا کہ ہم کسی خدا کے سامنے یاسوسائٹی کے سامنے یاکم ازکم اپنی ضمیراورذہنی خودداری کے سامنے ذمہ دارہستیاں ہیں جن کو ہم نے جواب دینا ہے۔وہ لوگ جن کو ہم دقیانوسی خیال کرتے ہیں یہ مانتے تھے کہ اُن کی روح کی نجات کا تمام دارومدارحق کی قبولیت اوراس کے اعلان پر منحصر ہے۔ اس قسم کی بزرگ ہستیاں بنی نوع انسان کے لئے باعث فخر تھیں لیکن دورِحاضرہ میں ہم چراغ لے کربھی ڈھونڈھیں توہم کو ایسے شخص نہیں ملتے جن کی زندگیاں ہم کو حق کی خاطر لڑنے مرنے پر مائل ومحرک کرسکیں۔ انگلستان کے متشرع پیوری ٹن ہماری نگاہوں میں شجاع نظر آتے ہیں حالانکہ نہ ہم ان کے عقائد کے معترف ہیں اورنہ اُن کے مجنونا جوش کے حامی ہیں۔ لیکن ہم ان کی اس واسطے قدرکرتے ہیں اوران کوو بعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ کیونکہ وہ حق کے متلاشی تھے اورحق کے اعلان کرنے میں وہ ذرا تامل نہ کرتے تھے۔ وہ اعلانِ حق کے وقت یہ خیال نہیں کرتے تھےکہ کیا یہ وقت اعلان کے مناسب اورموزوں ہے یا نہیں۔ کیا عوام الناس کی کثیر جماعت ہماری حمایت کرے گی یا نہیں۔ کیا اس کے کہنے سے ہم کو کوئی نقصان پہنچ گا یا نہیں۔ بلکہ ان میں سے ہرشخص حق کی خاطر اس طرح قائم رہتا تھاکہ گویا وہ ہر وقت خدا کی نگاہ کے سامنے کھڑا ہے"۔

۳

سابق وزیر ہند مرحوم نے مندرجہ بالا عبارت میں ہندوستان کے موجودہ لیڈروں کی گویا فوٹو اُتارکررکھ دی ہے اورعقلی

دلائل کے ذریعہ اُن کو اُن کی موجودہ روش کا نتیجہ بھی سمجھا دیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے خود غرض لیڈر بیچارے پیٹ کے غلام ہوتے ہیں۔ ان کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ علم اور عقل سے بالعموم خالی ہوتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے مذہبی رواداری کے متعلق غوروفکر کرنے کی زحمت تک گوارا نہ کی ہو اورجس کی بداعمالیاں ظاہر کرتی ہوں کہ خدا اس سے بیزار ہے اورجومذہب کے نام سے بیزار ہو اوراس کو ہندوستان کے حق میں لعنت کا طوق سمجھتا ہو۔ اس کو مذہبی رواداری کا سبق پڑھانے کا کوئی اختیار نہیں ہوسکتااورنہ ایسے شخص کی رواداری کوعقلی اوراخلاقی نقطہ نگاہ سے کوئی وقعت دی جاسکتی ہے۔ بلکہ اس کی رواداری اورمسالمت اس کے عقلی افلاس اخلاقی انحطاط اوراس کی رُوحانی پست حالی کی دلیل ہوگی۔

سچ تویہ ہے کہ بُزدلی اورکاہلی نے ہماری قوم میں ایک بے قاعدگی اورغیر ذمہ دارانہ آزادہ روی پیدا کردی ہے جواپنے آپ کو مذہبی رواداری کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ درحقیقت یہ حالت اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے خیالات بے ربط ہیں اورہم میں یہ لیاقت یاخواہش موجود نہیں کہ ان کو کسی نظام میں باہم پیوستہ کریں۔ ہمارے ملک میں خیالات اورنظریوں کی بھرمار ہے۔ لیکن چونکہ ان میں باہم کوئی ربط رشتہ یا سلسلہ نہیں ہوتا لہذا وہ بے لگام ہوتے ہیں اورعامتہ الناس لیڈروں اوراخبارایڈیٹروں کے حالات کے رحم پر ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گوہم تقریر اوربحث میں غوغاآرائی کرسکتے ہیں۔لیکن غوروفکر کرنے کے عادی نہیں ہوتے ۔ غورکا مقام ہے اُس قوم کا حشر کیاہوسکتا ہے جو رواداری اورلاپروائی میں تمیز نہ کرسکے۔اوردنیا اورآخرت دونوں جہانوں کے اہم ترین سوالوں کی جانب بے نیازی اورغیر جانبداری اوربے پروائی اختیارکرلے؟

خیالات کی بے ربطی اورتصورات کی بے قاعدگی اورالفاظ کا غیر معین مفہوم اس مصنوعی رواداری کی بنیادیں ہیں اور مسٹر گاندھی کی تحریروں اورتقریروں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ الفاظ کواستعمال کرتے وقت اُن کے مفہوم کو متعین اورمقرر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کیا کرتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات پراگندہ اورپریشان ہوتے ہیں۔ مثلاً ہریجن کی اشاعت مارچ ۳۰ ۱۹۳۴ء میں آپ کہتے ہیں کہ:

"مس لیسٹر(Miss Lester) کے لئے لفظ" مسیح" کا خواہ کچھ ہی مفہوم ہومیرے لئے تووہ کسی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ وہ ایک صفت ہے جس کا موصوف کوئی ایک تواریخی شخص نہیں ہے۔ پس ہرشخص کویہ اختیار ہے کہ وہ اپنے مذاق کے مطابق جس معلم اورپیشوا کویاکسی ایک منزہ عن الخطا شخص پیشوا معلم اورہادی کوحق مانے اوراس کو مسیح کہے"۔

مسٹرگاندھی کے خیالات کی پریشانگی کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ان اہم اُمورپر غوروفکرکرنے کی فرصت اورعادت نہیں اورآپ الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں وہ بالعموم مستعمل نہیں ہوتے اوران کواستعمال کرنے سے پہلے اپنے مفہوم کومعین نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کے لئے سوچ بچار کی ضرورت ہے اورسوچ بچار کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن بچارے مسٹر گاندھی کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ ان باتوں پر غوروخوض کرنے کے لئے فرصت نکالیں۔

پس نختیں بایدش تطہیر فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

ہمیں یہ بات ہرگوفراموش نہیں کرنی چاہیے کہ حق کوچھپانے سے ہم حق کی قدرواورمنزلت کوکم کرتے ہیں اورجیسامرحوم لارڈ مارلے کہتے ہیں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی جس نے حق کو دلیرانہ اظہارکا سبق نہیں سیکھا۔ پس جب قوم پرست ہم کو یہ صلاح دیتے ہیں کہ قوم کی خاطر اپنے خیالات کوجن کو تم سچ مانتے ہو دوسروں پر ظاہر مت کرو توہم حیران ہوکر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ صاحبان قومیت کو غلط رائے عامہ کی بنیاد پر۔ دنیا کی نکمی شان وشوکت وحشمت پرخود غرضی اورہوس پرستی پر اور ان تمام باتوں پر جوحق اورروحانیت کے منافی ہیں قائم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا کوئی شخص جومنافق ہو خوددارہوسکتا ہے؟ اورکیا منافقانہ بنیاد پر ہندوستان کی قوم کی عمارت کھڑی ہوسکتی؟

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تاثر یامیر ودیوارِ کج

یہ مصنوعی رواداری قوم کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہورہی ہے کیونکہ اس کے زیرِ اثر ہمارے ملک کے نوجوان سوچنے کی زحمت اٹھانا نہیں چاہتےاورمذہب اوراخلاق اوررسوم کے معاملہ میں یا تو دیدہ دلیری کے ساتھ جھوٹے اُصول کی حمایت کرتے ہیں

اوریامنافقانہ طورپر اخفائے حق کرتے ہیں اوراپنی حکمت عملی پر فخر اورناز کرتے ہیں۔

بریں عقل ودانش ببابد گریست

ان کا رویہ ثابت کرتا ہے کہ مذہب ان نوجوانوں کی زندگیوں پر حکمران نہیں رہا۔اُن کی ضمیر اُن کو ملامت نہیں کرتی اورتلاش حق کے ساتھ ہی ذمہ داری کا احساس بھی رخصت ہوگیا ہے۔ سچ تویہ ہے کہ جب بُری رُوح انسان کے دل کومذہب سے خالی پاتی ہے وہ سات اوربُری روحیں اپنے ہمراہ لاتی ہے اوراس شخص کا حال پہلے سے بدتر ہوجاتا ہے (لوقا ۱۱: ۲۶)۔

۵

بعض اوقات ہم کویہ کہا جاتاہے کہ اگرتم کسی عقیدہ کودرست اورراست سمجھتے ہو تو اس کو مان لو۔ یہ تمہارا حق ہے کہ تم اپنے کسی عقیدہ کو حق اورسچا سمجھو اوریہ حق خواہ مخواہ لوگوں میں جا اوربے جا۔ وقت بے وقت چرچا کرتے پھرو۔لیکن ہمیں یہ یادرکھنا چاہیے کہ حق اورراستی کسی کے باپ کا ترکہ اورمیراث نہیں ہوتے اورنہ کوئی شخص زمین اورجائداد کی طرح ان کا مالک ہوتاہے۔ اس کے برعکس جوشخص یہ جانتا ہے کہ اُس کو سچائی مل گئی ہے وہ ایک امین کی طرح ہوتا ہے ۔ جس کے پاس ایک امانت پڑی ہے جوکُل بنی نوع انسان کی ملکیت ہے۔ اس کو چین نہیں آسکتا تاوقتیکہ وہ امانت کا حق ادا نہ کرے۔ اوراگروہ خاموش رہے یا اخفاکرے توخیانت کا مجرم ہوگا۔ حق کو جاننے کی وجہ سے قوم کی ترقی کی امانت اس کی تحویل میں ہے۔ پس اگروہ خاموش رہیگا یا اخفا کرے گا توجھوٹ اور ناراستی کے عناصر غالب آکر قوم کی جڑوں کوکھوکھلا کردینگے جس طرح جسم میں زائد مادہ رہ کربدن میں زہریلا پھیلادیتا ہے۔ پس جو شخص اخفائے حق کرتا ہے یااعلان حق سے گریز کرتا ہے۔ وہ درحقیقت نوع انسانی کا خائن اورقوم کا غدارہوتا ہے۔

۶

مصنوعی رواداری کے مبلغین یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ ایک راسخ الاعتقاد شخص کے اعتقادات کی حدود کو تنگ دلی اورعدم رواداری پر محمول کرتے ہیں اورلوگوں میں اس کے خلاف پراپگینڈہ کرتے ہیں تاکہ ایسے شخص کے طرزعمل کواس کی اخلاقی پستی کا نتیجہ تصور کرلیا جائے ۔ رواداری بظاہر نہایت اعلیٰ اورفراخ شے دکھائی دیتی ہے۔ پس بعض انسان اس خوف سے کہ مبادا لوگ ان کو تنگ خیال ہونے کا طعنہ دیں اپنے ایمان وعقائد کو لوگوں پرظاہر

نہیں کرتے۔لیکن اس قسم کا رویہ نہایت بزدلانہ رویہ ہے۔ کسی باغیرت انسان کا یہ کام نہیں کہ وہ اس قسم کے خوف کے مارے اپنے ایمان وعقائد کو ترک کردے۔ اس قسم کی رواداری حقیقی فراخدلی نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایسے شخص کے عقائد کا اُس کی عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں۔ اوروہ ایمانیات کی جانب سے لاپرواہ ہے۔ اُس کا دل نورایمان سے بے بہرہ ہے یااس کا ایمان مردہ بانیم مردہ ہے۔ لیکن جب کسی شخص کا دل نورِایمان سے منورہوتا ہے اوراس کا زندہ ایمان اورزندہ عقائد کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے اس قسم کی غلط فراخ دلی کا فورہوجاتی ہے اوروہ عصبیت اورعدم رواداری میں تبدیل ہوجاتی ہے جودوسروں پرناجائز حملے نہیں کرتی بلکہ اپنے عقائد پر قائم رہ کر ازراہِ محبت نڈرہوکر دوسروں پر اپنے خیالات ظاہرکرنے سے نہیں شرماتی۔

۷

ہمارے سیاسی لیڈرپولیٹکل اُمورمیں خود اپنی تعلیم وتبلیغ پر عمل نہیں کرتے۔مثلاً کانگریس اورمسلم لیگ میں اختلافات ہیں۔ کانگریس کے اندرایک پارٹی گاندھی جی کی حامی ہے اوردوسری مسٹر سوبھاش چند ربوس کی حمایت کرتی ہے۔اوردونوں پارٹیاں اپنے اختلافات کے جو محض عارضی اورذاتی ہیں دُورکرکے ایک دوسرے سے رواداری کا سلوک نہیں کرتیں۔بلکہ اُن اختلافات کومدِنظر رکھ کر کبھی مسٹر نریمان پرسیاست کی جاتی ہے۔ کبھی ڈاکٹر کھارے پر عتاب نازل ہوتا ہے۔ کبھی سبھاش بابو کوکانگریس سے خارج کیا جاتا ہے حالانکہ سب کا نصب العین ایک ہی ہے۔پس سیاسی معاملات میں اختلافات کومٹادینے کے وقت رواداری کے حامیوں کی زبانوں پر مہرسکوت لگ جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس ان اختلافات کوقائم رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب فروری ۱۹۴۰ء میں مسٹرگاندھی بنگال ڈھاکہ میں مالیکنڈھ گئے توبعض لوگوں نے آپ کے خلاف مظاہرہ کیا۔تب آپ نے دورانِ تقریر میں فرمایا:

" اگرآپ حقیقی معنوں میں میرے پیرو ہیں توآپ کو ان مظاہروں سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ میرے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے ان کا حق ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کریں۔اگرگاندھی ازم کی پشت پرکوئی سچائی نہیں توقدرتی طورپر اُس کا خاتمہ ہوجائیگا۔ لیکن اگرگاندھی ازم سچائی کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے تووہ مظاہروں کے باوجود بھی زندہ رہیگا۔ ہمارے درمیان اختلافات ہوسکتے ہیں لیکن اگرہم پُر امن طورپر اپنے خلاف نعرے نہیں سن سکتے اوراپنے سے اختلافات رکھنے والوں کی طرف دوستانہ سپٹر کا اظہار نہیں کرسکتے توہم عدم تشدد پرکاربند ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے--- میں نے ابھی ابھی بعض لوگوں کو گاندھی ازم

مردہ باد کے نعرے لگاتے سنا ہے جولوگ گاندھی ازم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں ان کو ایسا کہنے کا پورا حق ہے۔۔۔جولوگ گاندھی ازم کے خلاف کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ نہیں بولنے کی آزادی دو۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ ان لوگوں کے خلاف کینہ کو اپنے دلوں میں جگہ نہ دو۔ جب تک پُر امن طورپر آپ اپنے مخالفین کی برداشت نہیں کرسکتے آپ آہمسہ کا سبق نہیں سیکھ سکتے۔۔۔۔ وہ جوکچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ ہم ایک دوسرے کو دشمن کیوں سمجھیں۔ ہمارے درمیان اختلاف ہے۔اس کے باوجود ہمیں ایک دوسرے کودوست سمجھنا چاہیے(پرتاپ۲۲ فروری ۱۹۴۰ء)۔

اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں:

"پریس کی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم صرف ان باتوں کے شائع ہونے کی اجازت دیں جوہم چاہتے ہیں کہ شائع ہوں۔ جابراور ستمگر فرمانروا بھی اس قسم کی آزادی کی حمایت کریگا۔ بلکہ ملکی آزادی اورپریس کی آزادی کا یہ مطلب ہے کہ ہم ان باتوں کے شائع ہونے کی اجازت دیں جوہمارے خیال میں ہمارے اغراض ومقاصد کے منافی ہیں "(ٹریبون ۱۵مارچ ۱۹۴۰ء)۔

ہم حیران ہیں کہ پولٹیکل امورمیں تویہ تعلیم دی جاتی ہے کہ باہمی اختلافات کونظر انداز نہ کرو۔ بلکہ صبر اورتحمل، برداشت اورشانتی سے ایک دوسرے کی سنو ورنہ قوم کا شیرازہ بکھر جائیگا۔ لیکن مذہبی اُمور میں جوسیاسی اُمور سے بدرجہا اہم ہیں۔ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ باہمی اختلافات کونظر اندازکردو اورپبلک کے سامنے اُن کا نام تک نہ لو۔ ورنہ قوم کا شیرازہ بکھر جائیگا۔

چنانچہ ۲۱جنوری ۱۹۳۷ء کے روزمسٹر گاندھی نے کوٹیم میں ہندوستانی مسیحیوں کومخاطب کرکے کہا:

"مسیحی جانتے ہیں کہ ان میں اور مجھ میں ایک غیر مرئی لیکن مضبوط رابطہ اتحاد ہے۔ میں جانتاہوں کہ مسیحیوں کی ایک بڑی تعداد میرےساتھ یہ مانتی ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب برحق ہیں ۔ مجھے بڑے درد سے کہنا پڑتاہے۔ کہ میں ہندوؤں کے توہمات سے واقف ہوں۔لیکن بایں ہمہ میں ہندورہونگا۔ کیونکہ میں یہ نہیں مانتا کہ ہندومت کے بنیادی اُصول دیگر بڑے مذاہب کےاصولوں سےمختلف ہیں۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ دنیا میں صلح اور آدمیوں میں رضامندی تب ہی قائم ہوسکتی ہے۔ اگرہم مذہبی بحث مباحثہ میں نہ الجھیں کیونکہ ایسا کرنا بے سود ہوتاہے"۔

واجب تویہ ہے کہ مسٹر گاندھی مذہبی اُمور کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک اعلان کریں کہ:

"جولوگ میرے مذہب کے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے ان کا حق ہے کہ اپنی رائے کا اظہارکریں۔ اگرمیرے مذہب کی پشت پر سچائی نہیں تواس کا خاتمہ ہوجائیگا لیکن اگروہ سچائی کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے تووہ نکتہ چینی کے باوجود زندہ رہیگا۔ مذاہب کے درمیان

اختلافات ہوسکتے ہیں۔ لیکن اگرہم پُر امن طورپر اپنے مذہب کے خلاف تقریریں نہیں سن سکتے اوراپنے سے اختلاف رکھنے والوں کی طرف دوستانہ سپڑٹ کا اظہار نہیں کرسکتے توہم عدم تشدد پرکاربند ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔جولوگ میرے مذہب کوتباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو ایسا کرنے کا پورا حق ہے۔جولوگ ہندودھرم کے خلاف کچھ کہنا چاہتے ہیں انہیں اس کی آزادی دو۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ ان لوگوں کے خلاف کینہ کو اپنے دلوں میں جگہ نہ دو۔ جب تک پُر امن طورپرآپ اپنے مذہب کےمخالفین کی برداشت نہیں کرسکتے، آپ آہمسہ کا سبق نہیں سیکھ سکتے، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ ہم ایک دوسرے کو دشمن کیوں سمجھیں ہمارے درمیان اختلاف ہے اس کےباوجود ہمیں ایک دوسرے کودوست سمجھنا چاہیے"۔

آپ ہی اپنے طرزِ عمل کودیکھیں
ہم کو کچھ عرض کرینگے توشکایت ہوگی

۸

جب ہم مسٹرگاندھی کی تقریروں اورتحریروں پرنظر کرتے ہیں توہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود ہندومذہب کی نکتہ چینی کرتے ہیں اوربعض اوقات ہندومت کے اُصول سے الگ اپنی رائے قائم کرکے اس کی صداقت پر اصرارکرتے ہیں۔ اوریہ رویہ کے خودساختہ اصول رواداری کے خلاف ہے۔ مثلاً آپ نے ایک دفعہ فرمایا:

میں یہ مانتاہوں کہ ورن آشرم کے متعلق جوتعلیم سمرتیوں اوردوسرے شاستروں میں دی گئی ہےوہ میرے عقیدہ کے خلاف ہے۔ میرے خیال میں شاستروں کا ایک ایک لفظ الہامی نہیں۔ شاستروں میں جوباتیں علم عقل اوراخلاق کے خلاف ہیں وہ غلط ہیں اورقابل قبول نہیں"۔

(ہندوستان ٹائمز ۲۵نومبر ۱۹۳۵ء)۔

جب گاندھی جی خودہندوشاستروں کی بعض تعلیمات کوعلم عقل اوراخلاق کے خلاف تسلیم کرتے ہیں اورخود ان باتوں کوجوآپ کے اپنے عقیدہ کے خلاف ہیں غلط قراردینے سے نہیں جھجکتے خواہ وہ سمرتیوں میں درج کیوں نہ ہوں تووہ کس منطق کی رو سے غیرہنود سے ہند واصول وعقائد کونیک نیتی سے پرکھنے کا حق چھین سکتے ہیں؟ ہندوستانی قوم کی حقیقی فلاح اوربہبودی اسی پر منحصر ہے کہ خیالات کی مکمل طورپر چھان بین اورپڑتال کی جائے اور صحیح کوغلط سے جُدا کرکے باطل کو ترک کردیا جائے اورصداقت کواختیار کیا جائے۔ لیکن صحیح کوباطل سے تب ہی جُدا کیا جاسکتا ہے جب اختلافات کونظر اندازنہ کیا جائے بلکہ ان کو پیش نظر رکھا جائے اور نیک نیتی سے ان کو علم وعقل اوراخلاق" کی کسوٹی پرپرکھا جائے"۔

حق تویہ ہے کہ ہر انسان کا یہ فرض ہے وہ اپنے عقائد سے جن کو وہ دل سے قبول کرتا ہے۔ بے وفائی اورغداری نہ کرے جوشخص آج ایمانیات کو قومیت پر قربان کرنے کو تیار ہے وہ بے باکی سے کل کے روزقومیت کوکسی اورشے پر بے دریغ قربان کردیگا۔اگرکسی شخص کا یہ ایمان ہے کہ اس کے عقائد درست صحیح اورعالمگیر ہیں یا کسی دسرے کے عقائد غلط ہیں اوروہ جہالت اورضلالت میں پڑا ہے۔ تواُس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کا علانیہ اظہار کرے۔ اگروہ حق پر ہے تودوسروں کوراہِ ہدایت پر لائے اوراگروہ غلطی پر ہے تو خودگمراہی سے بچے۔ اگرہندومسلمان اورعیسائی ایک دوسرے کے اختلافات کونظر انداز کرنے کی بجائے ان کو نگاہ میں رکھیں اورتحقیق حق کی خاطر تبادلہ خیالات کریں توکوئی وجہ نہیں کہ محض اختلافات کا وجود اُن کی باہمی پرخاش وجنگ وفساد کا موجب ہو۔حق تویہ ہے کہ اگرمختلف مذاہب ایک دوسرے کے اختلافات کو نگاہ میں رکھیں تواصلی اتحاد کی بنیاد پڑسکی ہے۔ مثلاً اگرزید یہ جانتا ہے کہ بکرکا نکتہ نگاہ اُس سے مختلف ہے تووہ بکرکے قول وفعل کو اس کے خیالات کی روشنی میں سمجھ سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اس نے فلاں بات کیوں کہی اور فلاں کام کیوں کیا اوراس طرح طرفین میں سمجھوتہ ہوسکتا ہے جودوستی اوراتحاد کا رابطہ قائم کرنے میں ممدومعاون ہوسکتا ہے ۔ لیکن اگربکر زید کو کہے کہ ہم دونو کا نقطہ نگاہ فی الحقیقت ایک ہی ہے اورہم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے توزید کو بکر کے اقوال وافعال پریشان کردیں گے۔اوروہ اپنے دل میں بکر کومنافق خیال کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ پس واجب تویہ ہے کہ زید اوربکر اس بات پر اتفاق کرلیں کہ وہ اپنے بنیادی اُصول اوراختلافات کونہیں چھپائینگے۔ تب وہ اپنے باہمی تعلقات میں ان امور سے پرہیز کرینگے جن سے دوسرے کو چوٹ لگے اور دونو لگاتاراس کوشش میں رہیں گے کہ محبت سے دوسرے کواپنا ہم خیال بنالیں اوریہی روش حقیقی اتحاد مصالحت اوررواداری کی بنیاد ہوسکتی ہے۔

چنانچہ ایک دفعہ مسٹرگاندھی کوایک ہندوطالب علم نے لکھا ہے کہ میرا ایک مسلمان دوست ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں ۔ لیکن بُت پرستی پر ہمارا جھگڑا ہوگیا ہے۔ میں کیاکروں ۔ مسٹرگاندھی نے جواب دیا:

"اگر تمہارا دوست تم سے حقیقی محبت رکھتاہے تووہ بُت پرستی کومتعصبانہ نگاہ سے نہ دیکھیگا جودوستی اس بات کا تقاضاکریت ہے کہ

دونوں کے خیالات اقوال وافعال ایک ہی قسم کے ہوں وہ دوستی پائدار نہیں ہوتی ۔لازم ہے کہ دوست ایک دوسرے کے مختلف خیالات اورافعال کی برداشت کریں"

(ہریجن مارچ ۱۹۴۰ء)۔

۱۰

ہم کو ہرممکن دلیل سے یہ سمجھایا ہے کہ ہم دوسروں کے خیالات کی عزت قدراورو ۔عت کرنی چاہیے ۔ اوریہ بات درست ہے اورتسلیم کرنے کے قابل بھی ہے۔ لیکن اگرہم پریہ واجب ہے کہ ہم دوسروں کے خیالات کی قدرومنزلت کریں۔ تولاکلام ہم پر یہ واجب ہوجاتاہے کہ ہم اپنے خیالات کوبھی قدرومنزلت کریں۔ لیکن اگرہم اپنے خیالات کو پردہ اخفا میں رکھینگے اوران کو لوگوں پرظاہر نہ کرینگے توہم کس طرح اپنے خیالات کی قدراورو ۔عت کرسکتے ہیں؟ پس جہاں یہ لازم ہے کہ ہم صبر وتحمل اورمحبت کے ساتھ دوسروں کی جو ہم سے اختلاف رائے رکھتے ہیں سنیں وہاں ہم پریہ بھی لازم ہے کہ ہم خود اپنے خیالات کو اس قدرو ۔عت دیں کہ ہماری زبانیں ان کی حقیقی ترجمان ہوں۔ اورترجمانی کرتے وقت ہم پریہ بھی لازم ہے کہ " ہم محبت کے ساتھ سچائی پر قائم رہیں"(افسیوں ۴: ۱۵)۔ اورسامعین پر لازم ہے کہ وہ ہمارے خیالات کو صبروتحمل اورمحبت کے ساتھ سنیں۔ سیدنا مسیح کے سنہری قانون پر کہ "جیسا سلوک تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو"(لوقا ۶: ۳۱)۔عمل کرنے سے ہندوستانی قوم کی مختلف جماعتوں میں رابطہ اتحاد قائم ہوسکتاہے۔

رواداری کااصلی مفہوم

حقیقی رواداری یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ایمان کی حدود کے اندر رہ کر محبت کی رُو سے اپنے عقائد کے علاوہ دیگر اشخاص کے مقابلہ کی برداشت کرے۔ اورجس طرح وہ خود چاہتاہے کہ اس کے عقائد کے لوگ بے دریغ پائمال نہ کریں وہ بھی دوسروں کے عقائد کوپاؤں تلے نہ روندے بلکہ ان کی واجبی قدرکرے اوراگر ان کوغلط تصورکرتاہے تومحبت آمیزالفاظ میں دوسروں کوسمجھائے کیونکہ:

محبت صابر ہوتی ہے اورمہربان ۔ محبت شیخی نہیں مارتی اورنازیبا کام نہیں کرتی اورنہ جھنجھلاتی ہے۔ وہ راستی سے خوش ہوتی ہے اورسب باتوں کی برداشت کرتی ہے"(۱کرنتھیوں ۱۳: ۴)۔

چُونکہ ایسے شخص کا عقیدہ خود معین اورمربوط ہوگا وہ محبت کے ذریعہ دوسروں کے عقائد کو جانچ سکے گا۔ اوران کو ازارہ ہمدردی قدر سے دیکھا گا۔ اورملائمت اورمحبت بھرے دل سے

گمراہوں کوسمجھا کر خود راستی پر قائم رہے گا اوردوسروں کو راہِ راست پر لائیگا ۔ حقیقی رواداری کی بنیاد محبت اورصرف محبت پر قائم ہوسکتی ہے جومسیحیت کا اصل الاصول ہے۔

کوئی شخص جوسیدنا مسیح کا حلقه بگوش ہے اپنے ایمان کو پردہ اخفا میں نہیں رکھ سکتا ۔ ہمارے آقا ومولا نے صاف فرمایا ہے کہ :

جوآدمیوں کے سامنے میرا اقرارکریگا میں بھی باپ کے سامنے جوآسمان پر ہے اس کا اقرارکروں گا مگر جوکوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکارکریگا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جوآسمان پر ہے اس کا انکارکرونگا" (متی ۱۰: ۳۲)۔

مسیحی اُصول کے اختلاف کی وجہ سے خواہ "آدمی کواس کے باپ سے اوربیٹی کو اس کی ماں سے اوربہُو کو اُس کی ساس سے جُدا ہونا پڑے"اورصورت حالات اس قدرنازك ہوجائے کہ " آدمی کے دشمن اُس کے اپنے گھر کے ہی لوگ ہوجائیں"(متی ۱۰: ۳۵)پھربھی کسی مسیحی کا یہ کام نہیں کہ ایمانیات کے اُمورمیں وہ اپنے مذہب ك اُصول اوراعتقادات سے غداری اوربے وفائی کرے۔ کیونکہ:

" جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اُسے کھوئے گا اورجو کوئی مسیح اور انجیل کے واسطے اپنی جان کھوئے گا وہ اسے بچائے گا"(مرقس ۳۵)۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہرقسم کے مناد فقانہ رویہ اورمصنوعی رواداری کوترك کردیں ۔ ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم دیگر مذاہب کے غلط اوربُرے پہلوؤں کی طرف سے آنکھ بند کرنے کی آزمائش میں نہ پڑیں۔ کیونکہ دورغ کے ساتھ رواداری کرنی فی الحقیقت حق کی مخالفت کرنی ہے۔ ایك جگہ مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ:

" رواداری اورمصالحت کی بنیاد اس پر ہے کہ فریقین کچھ چھوڑدیں ۔ لیکن بنیادی اُمورمیں ہم کسی بات سے دست بردارنہیں ہوسکتے ۔ کیونکہ بنیادی اُمورمیں مصالحت کرنا درحقیقت فریق ثانی کے آگے ہتھیار ڈال دینا ہے۔ مصالحت صرف اس حالت میں ہوسکتی ہے۔ جب فریقین بنیاد ی اُمور پر متفق ہوں"(ہریجن ۳۰مارچ ۱۹۴۰ء)۔

پس چاہیئے کہ جہاں مذاہب میں حقیقی اختلاف ہو اوراُن کے اصولوں میں ایك خلیج حائل ہو۔ ہم یہ نہیں کہیں کہ دونوں اُصول

درست ہیں۔ فرق صرف نقطہ نگاہ کا ہے، بلکہ اس کے برعکس ہم کو صاف علانیہ کہنا چاہیے کہ دو متضاد اصولوں میں سے ایک غلط نگاہ کا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ہم کو صاف علانیہ کہنا چاہیے کہ دومتضاد اصولوں میں سے ایک غلط اوردوسرا صحیح ہے۔ کیونکہ اجتماع الضدین امر محال ہے لیکن ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارا طرزِکلام ایسا ہو جس کے ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکے اورہمارا نصب العین دوسروں کے جذبات مجروح کرنا نہ ہو بلکہ ہمارا اصلی مقصد یہ ہو کہ اُن کی روحوں کو سچائی کی خاطر جیت لیا جائے۔

پس مسیحی کلیسیا پر لازم ہے کہ جب کبھی ان کے مبلغین کوہندومت یااسلام کے عقائد پر نکتہ چینی کرنی پڑے تووہ اپنے ناگوار فرض کو اس طور سے سرانجام دیں کہ دوسرے خیال نہ کریں کہ اُن کے عیوب ونقائص کو علانیہ ظاہر کرکے وہ اُن کی قومیت اورجماعت پر حملے کرتے ہیں یا مسیح اورمسیحی کی آڑ میں وہ بدیشی چیزوں اورخیالوں کی ہندی چیزوں اورخیالوں پر برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ بات ہندوستانی مسیحی مبلغین کے اصلی ارادہ اورجذبات کی ترجمان نہیں بلکہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ ہندوستانی مسیحیو ں کا اصلی مقصد یہ نہیں ہوتا کہ بدیشی چیزوں یا خیالوں یاغیر ملکی فلسفہ کا پرچارکریں بلکہ ہمارا حقیقی منشا یہ ہے کہ ہمارے ابنائے وطن ہندواورمسلمان دونوں خدا باپ کی ازلی اورابدی محبت سے جووہ گنہگار انسان سے کرتا ہے واقف ہوجائیں اورسیدنا مسیح کے قدموں میں آجائیں جس نے اس لازوال محبت کو اپنی تعلیم اورعمل سے بنی نوع انسان پر ظاہر کیا۔

مسیحی کلیسیا اورفرقہ وارانہ ذہنیت

کوئی شخص جس کے سر میں عقل ہے یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ مسیحیت کا وجود ہندوستانی قوم کے یک جاہونے میں رکاوٹ کا باعث ہے۔ پس اس کی تبلیغ واشاعت قومی مفاد کی بناء پر قانوناً بند نہیں کی جاسکتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تبدیلی مذہب سے غیر مسیحیوں کی تعداد وشمار پر ضرور اثر پڑیگااورفرقہ وارانہ تناسب کی وجہ سے ہندوؤں اورمسلمانوں کے سیاسی اقتدار میں ضرور فرق پڑیگا۔ لیکن مسیحی کلیسیا اپنی جماعت کی تعداد بڑھانے کی خاطر اور غیرمسیحیوں پر اپنا سیاسی غلبہ قائم کرنے کی خاطر لوگوں کو نجات کی دعوت نہیں دیتی بلکہ یہ اپنا فرض جانتی ہے کہ خداوند کے حکم

کی تعمیل کرے اوراپنے غیر مسیحی بھائیوں کو اُن کی غیر فانی رُوحوں کی نجات کی خوشخبری دے۔ ہندوستان کے مسیحی قوم کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ لیکن کسی ایک فرقہ کی ترقی کے خواہاں نہیں اورنہ وہ کسی ایک فرقہ کے سیاسی اقتدار اورغلبہ کوقائم رکھنے کی خاطر اپنے مالک اورمنجئی سے غداری کرنے کو تیار ہوسکتے ہیں۔

۱

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہندوستانی کلیسیا نے ان فرقہ وارانہ لڑائیوں اورخانہ جنگیوں میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ وہ آئے دن کے ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادوں کورنج اورافسوس کی نظر سے ہمیشہ دیکھتی رہی ہے۔اس کی نگاہ ہمیشہ قومی اتحاد اورشیرازہ بندی پر رہی ہے۔ ناظرین کویادہوگا کہ جب ہمارے ہندو اورمسلم برادران لندن کی گول میزکانفرنس میں فرقہ وارانہ تناسب پر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے تھے ہمارے ہندوستانی مسیحیوں نے فرقہ وارانہ تناسب کے اصول کو مذموم قرار دیا اورعلانیہ کہا تھا کہ یہ اُصول ہندوستانی قوم کے حق میں سمِ قاتل ہیں۔ اس گول میزکانفرنس کے سامنے ہرایک اقلیت نے سرکارِبرطانیہ کو اپنی گذشتہ خدمات کا واسطہ دے کر اپنے لئے خاص حقوق طلب کئے تھے۔مسلمانوں نے کہا تھا کہ ہم اپنی وفاداری کے لئے ہندوستان بھرمیں ممتازہیں۔ ہم نے نان کوآپریشن کے دنوں میں ہندوؤں کا ساتھ نہ دیا۔ ہم دہشت انگیز سیاسی تحریکوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ سکھوں نے کہا کہ ہم نے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں زبردست پیمانے پرفوجی خدمات کی تھیں۔یورپین اصحاب نے کہاکہ ہم نے ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے لئے لاکھوں پونڈ صرف کردئیے ہیں۔ لیکن ہندوستانی مسیحی کلیسیا کی "چھوٹی جھنڈ" نے سرکاربرطانیہ پر اپنے احسان نہ جتلائے۔ حالانکہ مسیحی کلیسیا اعداد وشمار کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں تیسرے درجہ پر ہے اوراس کو اپنی خدمات پر جواُس نے مادروطن کی خاطر سرانجام دی ہیں بجا طورپر ناز ہے۔ یہ مسیحی مبلغین کی مخلصانہ کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہمارا ملک اقوامِ عالم کے درمیان سر اٹھانے کے قابل ہوگیا ہے۔ ہندوستانی کلیسیا کی صرف اکی شاخ یعنی چرچ آف انڈیا بیس ہزار سے زائد سکول اورکالج تعلیم کی خاطر کھول رکھے ہیں (رومی کلیسیا کےسکولوں اورکالجوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے) اوران میں پندرہ لاکھ سے زیادہ ہندوستانی تعلیم پارہے ہیں۔ دورِ حاضرہ کے ہزاروں لیڈر انہی سکولوں کی بدولت اورکالجوں کی طفیل اس قابل ہوگئے ہیں کہ ملک

کی ہمہ تن خدمت کرسکیں۔ ان کے علاوہ کلیسیا نے ایک ہزار سے زائد شفا خانے کھول رکھے ہیں۔ جن میں چالیس لاکھ سے زیادہ مریضوں کی روزانہ بغیر کسی مذہبی امتیاز کے خبر گیری کی جاتی ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مسیحی کلیسیا کے افراد ہندوؤں سے تین گنا اورمسلمانوں سے چار گُنا زیادہ خواندہ ہیں ان تمام خدمات کے باوجود اپنے اعداد وشمار کے باوجود مسیحیوں نے گول میز کانفرنس میں اپنی جماعت کے لئے خاص حقوق طلب نہ کئے ۔ بلکہ فرقہ وارانہ اُصول کی مذمت کی کیونکہ ہندوستانی مسیحی فرقہ وارانہ ذہنیت سے پاک ہیں۔آل انڈیا کرسچن کانفرنس اورآل انڈیا کیتھولک کانگرس نے باربار یہ اعلان کیا ہے کہ فرقہ وارانہ تقسیم اورفرقہ وارانہ تناسب ہندوستان کے قومی مفاد کے حق میں مضرہیں کاشکہ کانگریس بھی ایسا کرتی۔

۲

حقیقت تویہ ہے کہ ہندوستان میں مسیحی کلیسیا ہی ایک واحد مذہبی جماعت ہے جوحقیقی معنوں میں قوم کی دلدادہ ہے اس امر کا حال ہی میں کانگریس کے چوٹی کے لیڈرمسٹر ستیامورتی نے مدراس کالج میں اقرار تھا۔فرقہ وارانہ تقسیم مسیحیت کے اصول کے عین نقیض ہے۔ کیونکہ مسیحیت کے اُصول الہٰی ابوت اورانسانی اُخوت ومساوات پر مبنی ہیں۔ مسیحیت اس بات پرزوردیتی ہے کہ ہر قسم کے متنازعہ فیہ امر کا فیصلہ آشتی صلح اورمحبت کے ساتھ کیا جائے۔لین فرقہ وارانہ ذہنیت کا رحجان یہ ہے کہ متنازعہ فیہ امورکا فیصلہ طاقت کے مظاہرے سے کیا جائے۔ جب تک ہم فقط اپنی جماعت کی ضروریات اور حقوق پیش نظر رکھ کر اپنی جماعت اورفرقہ کو مقدم اورہندی قوم کے دوسرے فرقوں کو موخر سمجھیں گے، تب تک فرقہ وارانہ آتش بھڑکتی رہے گی۔ پس ان حالات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستانی کلیسیا بے خوف و ہراس یہ اعلان کرتی ہے کہ باہمی فرقہ وارانہ کشمکش کا واحد علاج محبت کا وہ اُصول ہے جوسیدنا مسیح ہندوستان کے مختلف فرقوں اورگروہوں جماعتوں اورملتوں کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ تاکہ تمام ہندوستانی محبت اُخوت اورمساوات کی لڑی میں منسلک ہوکر ایک واحد قوم بن جائیں۔ دیگر مذاہب قومِ ہند کی تقسیم کرکے پاکستان اور"ہندوستان" قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان فرقہ پرست لوگوں کے لئے مذہب محض ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ان کا فرقہ دنیاوی ترقی اقتصادی غلبہ اورسیاسی اقتدارحاصل کرسکتا ہے۔

لیکن مسیحی کلیسیا مذہب کو دنیاوی اغراض کا آلہ کار نہیں بناتی اورنہ بنانا چاہتی ہے۔ لیکن اس پر بھی ہمارے غیر مسیحی برادران مسیحی کلیسیا کے وجودکوقومی مفاد کے خلاف خیال کرتے ہیں!

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید

جونہیں جانتے وفا کیا ہے

مسیحی کلیسیا اورقومیت

مسیحیت کے مخالفوں کی زبان سے عام طورپریہ سناجاتا ہے کہ ہندوستان کے مسیحی وطن اورقوم کے دشمن ہیں۔ اس سنگین الزام کے ثبوت میں گاندھی جی اوران کے ہم خیال ہندوستانی مسیحیوں کے مذہب اوران کے وسیع نکتہ نظر۔ ان کی بین الاقوامی سیاسی نگاہ۔ ان کی طرز رہائش رسوم ورواج وغیرہ کو پیش کرتے ہیں۔اس الزام کا اصلی سبب یہ ہے کہ الزام لگانے والے مسیحیت اورہندوستان کو ہند ونکتہ نظر اور سودیشی کے تنگ زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جس طرح پانی اپنی سطح سے اُوپر نہیں چڑھ سکتا اسی طرح بعض ہندو اصحاب اپنے مذہبی تعصبات اورفرقہ وارانہ نکتہ خیال سے اُوپر پروازنہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹرگاندھی اوراُن کے ہم خیال نام نہاد" قومی لیڈروں کی ہندوستان کے تمام فرقوں اورحلقوں کے دلوں میں وہ عظمت نہیں رہی جوچند سال ہوئے اُن کو حاصل تھی جب وہ صدق دل اورخلوص نیت سے تمام جماعتوں اورفرقوں کی قومی نکتہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

مسٹرگاندھی کہتے ہیں کہ مسیحیوں کی عادات اورطرز رہائش قومیت کے منافی ہیں۔ ہم اس الزام کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ الزام فرض کرلیتا ہے کہ تمام ہندوستان کے لوگ کسی ایک طرز رہائش۔ لباس، تمدن وغیرہ پر اتفاق رکھتے ہیں جوقومی نکتہ نگاہ سے کل قوم کا مقررہ معیار ہے اورہندوستانی مسیحی اس قومی معیار کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے۔لیکن یہ اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی ایسا معیارزندگی نہیں اورنہ اس کی تاریخ میں کبھی ایسا معیارقائم کیا گیا ہے ۔ غالباً مسٹرگاندھی کا اصلی مطلب یہ ہے کہ مسیحی جماعت کے افراد ہندوؤں کی خاص رسوم اورطرز لباس ، طرزرہائش نشست وبرخاست ۔ کھانا پینا وغیرہ کے پابند نہیں ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کا طرزتمدن قومی معیارنہیں ہے۔ اورنہ وہ قومی معیارقراردیا جاتایاقراردیا جاسکتا ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہندوجماعت کے تمام افراد بھی کسی ایک طرز تمدن

اوربہائش پر متفق نہیں ہیں۔ مثلاً جنوبی ہند کی برہمن عورتیں غیر برہمنوں کا سا لباس نہیں پہنتیں بلکہ ان کی گھریلوں بولی ایسی ہے کہ اس کو سن کر غیر برہمنوں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ ہندو دائرہ کے اندر ہر ذات اورفرقہ کی زبان طرزِ رہائش طرز تمدن وغیرہ میں اختلاف ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں توہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں توچرچا نہیں ہوتا

سچ تویہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصص کے نوے فیصدی مسیحی دہی طرز تمدن رکھتے ہیں۔ جواُن کے آباواجداد کا تھا۔ مسیحی ایمان ہندو دھرم یا اسلام کی طرح اپنے مقلدین کوکسی خاص لباس، کھانا پینا، نشست وبرخاست طرز رہائش وغیرہ کسی خارجی بات کی نسبت مجبورنہیں کرتا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:

کسی خاص قسم کا کھانا ہم کو خدا سے نہیں ملائے گا"(۱کرنتھیوں ۸باب ۸آیت)" خدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اورمیل ملاپ اوراُس خوشی پر موقوف ہے جوروح القدس کی طرف سے ہوتی ہے(رومیوں ۱۴: ۱۷۔مرقس ۷باب وغیرہ)۔

ہم اس نکتہ کو طول دینا نہیں چاہتے کیونکہ ہم اپنے رسالہ کلمتہ اللہ کی تعلیم میں اس بات پر مفصل بحث کرچکے ہیں۔ ہندوستانی مسیحی اپنی قوم کا غدارنہیں ہوتا۔ وہ صرف فرسودہ عقائد اورباطل اصولوں کوترک کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی سیاسی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوجاتا بلکہ چاہتا ہے کہ سیدنا مسیح سے توفیق پاکر وہ ان کوکماحقہ سرانجام دے ۔ وہ مسیحی عقائد کو قبول کرتا ہے۔ لیکن مغربی خیالات کو کورانہ تقلید نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کلیسیائے جامع کا صحیح ایمان ہندوستانی پیرایہ میں پیش کیا جائے تاکہ مسیحیت ہندوستان میں بدیشی خیالات کا مجموعہ نظر نہ آئے ۔ وہ مسیحی ایمان کی مغربی فلسفہ اورخیالات کے عوارض سے جُدا کرکے ان کو مشرقی فلسفہ کے لباس میں مزین کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ کسی کوغیر مانوس معلوم نہ ہو۔وہ اس بات کا بھی خواہاں نہیں کہ مغربی ممالک کی کلیسیاؤں کے مذہبی رسوم ورواج کو غلامانہ ذہنیت سے اختیارکرلے۔ اُس کو اس بات پر ناز ہے کہ ہندوستانی مسیحیوں کو خدا نے ایک قومی وراثت بخشی ہے جو نہ ہندونہ مسلم بلکہ ہندوستانی وراثت ہے اورکہ مسیحی اس وراثت کے نگہبان اورمختار اورمین ہیں۔ پس وہ چاہتا ہے کہ وہ دیانتدار

مختاروں کی طرح اس وراثت کی نگہداشت کرکے کلیسیائے جامع کی خاطر اس کا جائز استعمال کرے تاکہ بنی نوع انسان کی ترقی ہو۔ ہمارے غیر مسیحی برادران ابھی سیاسی اُمور میں سوراجیہ کا مطالبہ کررہے ہیں۔ لیکن ہندوستانی مسیحیوں نے مذہبی اُمور میں سوراج حاصل کرلیاہوا ہے۔ چنانچہ کلیسیائے ہندوستان برماولنکا کلیسیائے جامع کا ایک خود مختارحصہ ہے اوراس کا نصب العین یہ ہے۔ کہ ہم ہندوستان میں

پاک واحد اوررسولی کلیسیائے جامع کواس طور سے پیش کریں کہ ہمارے ملک کے فرزند اس کلیسیا کواپنا حقیقی روحانی گھر سمجھنے لگیں اوراپنے ہمراہ اپنی کلچر(ثقافت) کی دولت واقتدار لے کر اس میں شامل ہوں۔اس کلیسیا کے تمام بشپوں کی یہ دعا ہے کہ یہ ملک خدا کے جلال کے اُس علم کی طرف رجوع کرے جس کا مظہر سیدنا مسیح ہے ۔ تاکہ ہندوستان جواُس کے فیض سے تاحال محروم ہے موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہوجائے"(ضابطہ صفحہ ۷، ۸)۔

ان روشن حقائق کے باوجود اخبار انڈین سوشل ریفارمر کے ہندوایڈیٹرکی دیدہ دلیری ملاحظہ ہووہ لکھتا ہے:

ہمارے دیس میں تبلیغی مشنوں کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی روایات اورزندگی اورکلچر کوتباہ کریں"(۲۵۔ مئی ۱۹۴۰ء)۔

درازدستی ایں کوتاہ آستیناں بیں

ہندوستان کے مسیحی ہمیشہ اس بات پر اصرارکرتے رہے ہیں کہ اگرچہ اُنہوں نے ہندومت یااسلام یاسکھ مذہب کوترک کردیا ہے تاہم وہ ہندوستانی قوم کے فرد ہیں۔ غیرمسیحیوں نے تویہ خیال کر رکھا ہے کہ جب انسان اپنے مذہب کوترک کرتا ہے تووہ اپنی قوم کو بھی ترک کردیتا ہے۔اس لحاظ سے ہندوستان بہت سی اقوام پر مشتمل ہوگا۔ اسلامی قوم، ہندی قوم، سکھ قوم وغیرہ۔ مسلم لیگ کا جوسالانہ جلسہ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں ہوا۔ اُس نے ہندوستان کےمسلمانوں کوایک جداگانہ قوم قراردے دیا ہے۔ اوریہ اس ذہنیت کا لازمی اورمنطقی نتیجہ ہے۔ جب ہندواورمسلمان کسی شخص کو مذہب کے ترک کرنے پر اپنی ذات برادری خاندان ملت اورقوم سے خارج کردیتے ہیں تو وہ گویا تسلیم کرلیتے ہیں کہ اس ملک میں جتنے مذاہب ہیں اتنی ہی قومیں آباد ہیں اورکہ انسان اپنے مذہب کو ترک کرنے پر اپنی قوم کو بھی ترک کردیتا ہے۔لیکن

ہندوستان کے مسیحیوں نے اس قسم کے نظریہ کوکبھی قبول نہ کیا اوروہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہلانا باعثِ فخر خیال کرتے رہے۔ ان کے نزدیک قوم ایک سیاسی تصوررہا ہے جس کا مذہب کی تبدیلی کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں۔ مسیحیوں اورغیر مسیحیوں کے تمدنی اورتعلیمی اوراقتصادی حالات و روایات میں کوئی فرق نہیں ۔ دونوں ایک ہی مادروطن کے فرزند ہیں۔ اورایک ہی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ہندوستانی مسیحی صرف مذہبی آزادی چاہتے ہیں اوراس مطالبہ میں کوئی صاحب ہوش یہ نہیں کہیگا کہ وہ حق اورراستی پر نہیں ہیں۔ وہ جو قیصر کا ہے قیصر کودینا چاہتے ہیں اورجو خدا کا ہے وہ خدا کا دینا چاہتے ہیں۔(متی ۲۲باب ۲۱۔ رومیوں ۱۳: ۶تا ۷)۔

۲

ہندوستان کے مسیحی محبِ وطن ہیں۔ اوروہ یہ گوارا نہیں کرتے کہ کوئی گورنمنٹ مسیحیت کواپنی سیاسی اغراض کی خاطر آلہ کاربنائے اورلوگوں اورملکوں کو اپنی ملوکیت کی خاطر غلامی کا طوق پہنائے۔ مسیحیت ایک غالب اورفاتح مذہب ہے۔ جس کا سیاسی غلبہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کسی دوسرے ملک کی ملوکیت سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ مسیحی ملوکیت ادیانِ عالم پر حاوی ہے اورتمام ممالک وازمنہ کے افراد مسیح کے آگے سربسجود ہیں(افسیوں ۱: ۲۱)۔ بسااوقات مسیح کی ملوکیت اورسیاسی ملوکیت میں تصادم واقع ہوا۔ہزاروں بادشاہوں نے مسیحیت کو اپنا آلہ کار بنانا چاہا۔لیکن وہ ناکام رہے اورمنجئی عالمین کی ملوکیت سب پر غالب آئی۔ پس گوہندوستان کی مسیحی کلیسیا حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہےلیکن وطن پرست نہیں ہے۔کیونکہ وہ قوم اوروطن کی نہیں بلکہ خدا کی پرستش کرتی ہے۔ حب الوطنی اورقوم پرستی یاوطنیت دوجُداگانہ باتیں ہیں۔ قوم پرست صرف اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے وہ غیروں سے محبت نہیں رکھتا۔اس کی گردن صرف اس کی اپنی قوم کے آگے جھکتی ہے اوروہ خیال کرتا ہے کہ اس کی قوم کی ہر چیز اورہربات اچھی ہے اوراس میں کچھ نقص نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف اپنی قوم کی ترقی اورخوشحالی کا خواہاں ہوتا ہے۔ خواہ دیگر اقوام کو پائمال کرنے سے حاصل ہو۔ دیگر اقوام کی ضروریاتِ زندگی سے اس کو مطلق سروکار نہیں ہوتا۔ اس نصب العین کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم پرست کا ملک غالب اورزبردست ہوجاتا ہے اوردیگر اقوام وممالک مغلوب اورزیردست ہوجاتے ہیں اوریہ صلح

کش مقصد دنیا کے جنگوں کے آغاز کا اصلی سبب ہوتا ہے۔ پس ہندوستانی مسیحی کلیسیا اس قسم کی وطنیت اورقوم پرستی کے تصورس اتفاق نہیں کرسکتی۔ کیونکہ یہ طرزعمل بنی نوع انسان کی اُخوت ومساوات اور محبت کی منافی ہے۔ لیکن ہندوستان کی مسیحی کلیسیا محبِ وطن ہے۔ قوم پرستوں کی طرح مسیحی اپنے مادروطن سے محبت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ قوم پرستوں کی مانند غیروں سے نفرت وحقارت کا سلوک رکھنے کے روادار نہیں ہوسکتے۔ ہندوستانی مسیحی اپنے ملک کو ہر شے کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے بلکہ اپنے ملک کے عیوب ونقائص مثلاً جہالت ذات پات کی تمیزعورتوں کی پست حالت ، بے ہودہ روایات، اقتصادی اورسیاسی کمزوریوں وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں اورہر مکن طورپر جدوجہد کرتے ہیں کہ ہندوستان جنت نشان کے چہرہ زیبا سے یہ بدنما داغ دورہوجائیں۔ وہ اپنے مادرِوطن پر نازاں ہیں۔ لیکن بے جا فخر کرکے دیگر ممالک واقوام کی اچھی چیزوں کو پس پشت نہیں پھینکتے۔ ان کا نصب العین یہ نہیں کہ صرف ہندوستان ہی خوشحال اورترقی پذیر ہو وہ دیگر ممالک واقوام کی ترقی کے بھی خواہا ہیں۔ اوران کے خیالات روایات اورثقافت کوبھی قابلِ و بعت خیال کرتے ہیں اوران کو بدیشی قرار دے کر بغیر سوچے سمجھے رد نہیں کردیتے۔ وہ ہندوستان کو بین الاقوامی خاندان اورنوع انسانی کا جزولاینفک سمجھ کر ملکی ترقی کو سیم وزر کی محک پر نہیں بلکہ نیکی انصاف راستبازی اورمحبت کے معیار سے پرکھتے ہیں ۔ وہ خدا کی بادشاہی کوہندوستان میں قائم کرنا موجب سعادت داریں خیال کرتے ہیں۔ اُن کا نجات دہندہ کل دنیا کے ممالک واقوام کو اورکل بنی نوع انسان کوبچانے کے لئے آیا تھا۔ تاہم وہ اپنے وطن کو اس قدرپیارکرتا تھاکہ اُس کی خاطر زا رزاررویا تھا (لوقا ۱۹:۱۴، ۱۳: ۳۴تا ۳۵ وغیرہ)پس اس نمونہ کے مطابق تمام جہان کے مسیحیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے وطن سے محبت رکھیں۔ لیکن لازم ہے کہ ان کی محبت کسی ایک ملک قوم یاطبقہ تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ان کی محبت کا دائرہ اس قدروسیع ہو کہ دوست اوردشمن اپنوں اورغیروں پر حاوی ہو(متی ۵: ۴۸وغیرہ)۔

مسٹرگاندھی کے نظریہ وطنیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وطن کو مذہب پر مقدم رکھاجائے۔چنانچہ ۱۹۲۹ء میں لاہورکی کانگریس کے اجلاس میں پنڈال کے اُوپر ایک جھنڈا نصب تھا۔ جس پر لکھا تھاکہ ملک مقدم ہے اورمذہب موخر ہے۔ ہندواپنے وطنیت کے

عقیدہ کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں بعد میں ہندو اوراُنہوں نے اس عقیدہ کوقوم پرستی کا لازمی جزو اورظاہری نشان قراردے دیا ہواہے۔لیکن مسیحیت کی تعلیم اس کے برعکس ہے اس کے عقائد ہمیں یہ سکھلاتے ہیں کہ مسیح کو وطن پر مقدم سمجھا جائے۔ لیکن یہ یادرکھنا چاہیے کہ کوئی شخص سچا مسیحی نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس میں حب الوطنی نہ ہو۔ کیونکہ مسیحیت زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اس لئے وہ اوّل بھی مسیحی ہے اورآخر بھی مسیحی ہے اورچونکہ اس کی ساری زندگی مسیح کی حکومت کے ماتحت ہے لہذا اس کی سیاسیات اس کے مذہب سے جُدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ اس کی سیاسیات سیدنا مسیح کے ماتحت ہوں گی لہذا اس کی سیاسیات اس کے مذہب سے جدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن چونکہ اس کی سیاسیات سیدنا مسیح ہوں گی۔ لہذا اس کی حب الوطنی سے یہ لازم نہیں آئیگا کہ وہ دیگر اقوام وممالک کواپنے دائرہ محبت سے خارج کردے۔ بلکہ حق تویہ ہے کہ بین الاقوامی خیالات کو مسیحیت اورصرف مسیحیت ہی کی بدولت فروغ ہواہے۔ مسیحی مشنریوں کی طفیل اس قسم کے تعلقات ترقی پاگئے ہیں۔ مرحوم سی۔ایف اینڈروز جیسے انسانوں نے مشرق ومغرب کوباہمی محبت کے بندھنوں میں جکڑدیا ہے۔ مسیحی اصول ابوت الہٰی اوراُخوت ومساوات انسانی کی وجہ سے ایشیا، افریقہ یورپ امریکہ وغیرہ مختلف براعظموں کے باشندے اپنے آپ کو بیش ازپیش ایک ہی قسم کے انسان اورایک ہی نوع کے فرد سمجھنے لگ گئے ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ مسیحیت کا تعلق کسی ایک قوم یازمانہ یا ملک کے ساتھ نہیں ہے۔کلمتہ اللہ ملک کنعان میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے ۔ لیکن آپ نے ایسی تعلیم اوراصول بتلائے جن کا اطلاق کل بنی آدم پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جونام آپ نے اپنے تجویز فرمایا وہ" ابن آدم" تھا(متی ۱۶: ۱۳ وغیرہ)۔ پس اگرنوع انسانی ترقی کررہی ہے تو صرف آپ کے اصولوں کی طفیل ترقی کررہی ہے۔ اوراگرزمانہ مستقبل میں وہ ترقی کرسکتی ہے توصرف سیدنا مسیح کے کلمات طیبات اورارشادات پرگامزن ہوکر ہی ترقی کرسکتی ہے۔ نوع انسان کا مستقبل منجئی عالمین کی ذات سے وابستہ ہے۔ کیا ہمارے وطن میں قومی نسل اور مذہبی تعصبات کو پسِ پشت پھینک کراس پر ایمان نہ لائیں گے تاکہ ان کو سعادتِ دارین نصیب ہو؟

باب چہارم
سودیشی مذہب کے اُصول

سوامی دیانند جی اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں برہمو سماج کا کھنڈن کرکے فرماتے ہیں۔

"برہمو سماجیوں نے جو عیسائی مذہب میں شامل ہونے سے تھوڑے سے آدمیوں کو بچایا اورقدرے بُت پرستی دُور کی۔ یہ اُن کی باتیں اچھی ہیں۔ لیکن اُن میں حب الوطنی بہت کم ہے۔ اپنے ملک کی تعریف اوراپنے بزرگوں کی عزت کرنی تودرکنار ان کی مذہب پیٹ بھر کرکرتے ہیں اوراپنی تقریروں میں عیسائی وغیرہ انگریزوں کی تعریف کرتے ہیں۔برہما وغیرہ مہارشیوں کا نام بھی نہیں لیتے۔ ان کی کتاب میں عیسیٰ ، موسیٰ، محمد ،نانک اورچیتن کے نام لکھے ہیں۔ کسی رشی مہارشی کا نام بھی نہیں ہے۔ بھلاجب آریہ درت میں پیدا ہوئے ہیں اوراسی ملک کا آب ودانہ کھاتے پیتے ہیں اور کھائیں پیئں گے۔توپھر ان کواپنے باپ دادا کے طریق وغیرہ کوچھوڑدو سروں کی طرف زیادہ راغب ہونا اپنے ملک کی زبان سنسکرت کے علم ادب سے بے بہرہ ہونا بنی نوع انسان کے لئے دائمی) اورمفید کام کس طرح ہوسکتاہے" (ستیارتھ پرکاش باب ۱۱)۔

اسی طرح رام کرشن پرم ہمس کہتے ہیں کہ تمام مذاہب برابر ہیں لیکن ہندوؤں کے لئے" سناتن دھرم بہترین دھرم ہے،کیونکہ وہ ہندوستان کے رشیوں کا دھرم ہے"۔

مسٹرگاندھی کی تحریرات کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتاہے کہ آپ ہندومذہب کواس واسطے مانتے ہیں کیونکہ آپ ہندوخاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ اگرکسی شخص کے دل میں ہندومذہب کے متعلق شکوک پیدا ہوئے ہیں تومسٹرگاندھی اس کو یہ صلاح دیں گے۔ کہ تم اپنے ملک کے مذہب پر قائم رہو خواہ تم کو کوئی دوسرا مذہب اچھا معلوم ہو۔ یہ مذہب تمہارا آبائی مذہب ہے۔ اوراگرتم اس میں خرابیاں دیکھتے ہو تو ان خرابیوں کی اصلاح کرلو۔ لیکن اس کو ترک مت کرو۔

درحقیقت یہ امر گاندھی جی کے سودیشی اُصول کا ایک نتیجہ ہے۔ جس طرح وہ اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں کہ اپنے ملک کی پیداوارپر گذران کرو خواہ تم بیرون جات سے بہتر شے مہیا کرسکو اُسی طرح وہ ہندومذہب کوقبول کرتے ہیں اورجوباتیں اُس میں اخلاق کے خلاف ہیں وہ اُن کو رد کرتے ہیں۔ اگروہ کسی مسیحی ملک میں پیدا ہوتے ہیں اوراُن کے ملک کا مذہب ہندومذہب ہے۔ لہذا وہ

طنیت کے اصول کی وجہ سے اپنے سودیشی مذہب کے قائل ہیں۔ وہ اس واسطے ہندونہیں کہ ان کے خیال میں ہندومت درحقیقت بہترین مذہب ہے بلکہ وہ اس واسطے ہندو ہیں کیونکہ ہندومت ہندوستان کا مذہب ہے ۔ ان کے لئے وطنیت کا سودیشی اُصول ہند کی اقتصادیات اورسیاسیات اورمذہب سب پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح اقتصادیات اورسیاسیات میں سودیشی اُصول کے قائل ہیں۔ اسی طرح وہ مذہبی امورمیں سودیشی اُصول پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ہر شخص کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ باوجود اپنے آبائی مذہب کی بطالت کے اس پر قائم رہے اوراس کوشش میں رہے کہ اس کی خرابیوں کو حتی الوسع دوکرے چانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

" ہر قوم اپنے ملک کے مذہب کو دیگر مذاہب کے برابر خیال کرتی ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں :

" اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کے مذہب اس ملک کے لوگوں کے لئے کافی اوروافی ہیں۔ ۔۔ ہندوستان کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک مذہب کو ترک کرکے دوسرے کواختیارکرے۔۔۔ اگرمسیحی مشنری بنی نوع انسان کی بہبودی کے کام۔ مثلاً سکول، ہسپتال، وغیرہ کا کام کرنے کی بجائے ہندوستان کے لوگوں کو مسیحیت کے حلقہ بگوش کرنا چاہتے ہیں تومیں اُن سے یقینی طورپر یہی کہونگا کہ آپ ہمارے ملک سے رخصت ہوجائیں" ۔کیا خوب!!

مسٹرگاندھی کے جانی دوست مرحوم مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈروز کہتے ہیں کہ:

" مہاتما گاندھی راسخ الاعتقاد اوررجعت پسند ہندوؤں میں سے ہیں۔آپ میں روحانی آزادی کا احساس زبردست ہے۔ اورآپ کے دل میں ہندو مذہب کی اصلاح کا خیال کاجاگزیں ہے۔ سودیشی آپ کا مذہبی اصول ہے۔ اوراس اصول کی وجہ سے وہ اپنا آبائی مذہب ترک کرکے کسی بدیشی مذاہب کو قبول کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے ۔

۲

ہمارے قوم پرست نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ہرقسم کے مذہب کے خلاف ہے ۔ ہم سطوربالا میں ذکرکرچکے ہیں کہ وہ مروجہ مذاہب سے بیزارہیں۔ لیکن چونکہ کسی بالا ہستی کو ماننا انسانی فطرت میں داخل ہے۔لہذا ایسے وطن پرستوں کے فطرتی تقاضا

کوپورا کرنے کے لئے ان کے لئے ایک نیا مذہب تجویز کیا گیا ہے۔ یعنی بنارس میں ایک مندربنایا گیا ہے۔جس میں ہندوستان کا ایک بڑا نقشہ رکھا دیا گیا ہے اوروہاں اس مندرمیں بھارت ماتا کی پرستش کی جاتی ہے۔دیشی بھگتی کے مہاتما مسٹرگاندھی نے ۱۹۳۶ء میں وسہرہ کے دن اس مندرکی افتتاحی رسم کو ادا کیا تھا۔ اوراس اقسم کی پرستش کی تعریف میں چندکلمات بھی فرمائے تھے۔ ہم نے یہ اخباروں میں پڑھا ہوا تھا کہ ہٹلر کے زیر اثر جرمنی کے لوگ مسیحی اصول اخوت انسانی کو ترک کرکے ایک ایسا مذہب اختیارکررہے ہیں جس میں جرمنی کے قدیم دیوتاؤں کی عظمت ، غیر جرمن لوگوں اورمذہبوں سے نفرت اورآرین نسل کے آدمیوں میں اُخوت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب ہم نے خود ہندوستان میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیاہے۔ کہ مہاتما جی ہندوستانیوں کے لئے ایک ایسے مذہب کی بنیاد قائم کرنا چاہتے ہیں۔جس میں ہندوؤں کے قدیم دیوتاؤں کوعظمت دینے کی۔ غیر ہندی اُصول کو ترک کرنے کی اورآرین نسل کے سودیشی آدمیوں میں اُخوت کی تعلیم دی جائے تاکہ ہندوستان کے باہر کے مذاہب اوراُن کے پیروؤں کو بدیشی قرار دے کران کو اپنے اقتصادی اورسیاسی غلبہ سے خاموش کردیا جائے۔

ہم کوافسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان اورہندوستانی قوم کے حق میں یہ نئے معبود اوردیوتا اُن کے پُرانے معبودوں اور قدیم دیوتاؤں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ ہمیں جرمنی سے اس معاملہ میں سبق حاصل کرنا چاہیے اورعبرت پکڑنی چاہیے تاکہ ہمارے ملک اور قوم میں اس قسم کے زہریلے جراثیم نہ پھیل جائیں۔ جس کا نتیجہ خانہ جنگی تباہی اوربربادی ہوتی ہے اگرہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں یگانگت اوراتحاد پیدا ہوتو ہم کو اس قسم کے مذہب کو اختراع کرنے اور تقویت دینے اوراس کا پرچار کرنے سے محترزررہنا چاہیے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جوپیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔

۳

مذہب کے اُمورمیں وطنیت اورسودیشی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مذہب تویک طرف دنیاداری کے معاملات سودیشی کے اُصول پر نہیں چل سکتے ، جوشخص اقتصادیات پر غورکرنے کی زحمت اٹھاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی قوم اقتصادی طورپر ترقی نہیں کرسکتی جوسودیشی کے اصول پر عمل کرکے اپنے آپ کو اقوام عالم سے الگ کرلیتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت

کومدِنظر رکھ کر سودیشی کا اصول تھوڑی مدت کے لئے کارآمد ہولیکن اگریہ اصول ہمیشہ کے لئے ہندوستان پر عائد کیا جائیگا توہمارے ملک کے تنزلی کا باعث ہوگا، جہاں تک سیاسیات اوراقتصادیات کا تعلق ہے دنیا کے ممالک سودیشی کے اُصول کوترک کررہے ہیں۔ تاکہ وہ ترقی کرسکیں جس طرح اُنہوں نے علم اور سائنس میں سودیشی کے اُصول کوترک کردیا ہے، علم اورسائنس کے نظرئیے خواہ ان کی ابتدا ء کسی ملک یا قوم سے ہوئی ہو دنیا کے ہرگوشہ میں اورہندوستان کے ہر کونے میں حق اوردرست مانے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے دریا کی موجوں کو مسٹرگاندھی اپنے منہ کے الفاظ سے روک نہیں سکتے۔ یہ دریا تمام مصنوعی رکاوٹوں کو اپنے آگے بہالے جاتا ہے۔ اس کی ٹکریں تمام قومی دیواروں کوگرادیتی ہیں۔ اورسودیشی اصول خس وخاک شاک کی طرح بہے چلے جاتے ہیں۔ خدا جوکل بنی نوع انسان کا خالق اورباپ ہے چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے ایک خاندان کے ممبراورایک بدن کے اعضا ہوکراس دنیا میں زندگی بسرکریں۔

جس شخص نے مسیحیت کا سطحی مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ اس پر یہ واضح ہوگیاہوگا کہ مسیحیت ان خیالات کی ابتدا ہی سے مخالف رہی ہے۔ مثلاً آبائے کلیسیا میں سے کلیمنٹ اوراوریجن دونوں مسٹرگاندھی کے مندرجہ بالا خیال کی رد میں کہتے ہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی شخص کواپنے باپ دادا کا مذہب ترک نہیں کرنا چاہیے تب ہی درست ہوسکتا ہے اگروہ مذہب درست اورصحیح ہے۔کسی مذہب کی حقانیت کا ثبوت یہ نہیں کہ یہ دین ہمارے باپ دادا کا دین ہے بلکہ یہ کہ وہ حق ہے ۔ اگرکوئی مذہب حق پرنہیں تو یہ خیال کہ وہ ہماراآبائی مذہب ہے اس کے ترک کرنے میں سدراہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے باپ دادا کا خیال تھاکہ وہ مذہب حق پر ہے لہذا وہ اُسکومانتے بھی تھے لیکن اگرہم اس مذہب کوباطل جانتے ہیں اورترک نہیں کرتے توہم اپنے باپ دادا کے اصول پرنہیں چلتے۔اوریجن نہایت پرزور الفاظ میں کہتا ہے کہ مختلف مذاہب میں جوفرق ہے وہ نہایت اہم ہے۔ اورلازم ہے کہ ہم تمام انسانی روایات اوردستورات کوترک کرکے حق کی پیروی کریں۔

۵

مسٹرگاندھی اوران کے ہم خیال ہندو لیڈر اپنے خودساختہ طنیت اورسودیشی کے اُصول کی وجہ سے مجبورہیں کہ وہ ہندومت کے نقائص کے باوجود اس کی پیروی کریں۔لیکن کیا یہ طریقہ ان کے اصول کے مطابق ہے جس پر وہ نازکرتے ہیں کہ میں ہمیشہ حق کی پیروی کرنا چاہتاہوں؟

علاوہ ازیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ تم ہندومذہب میں جونقائص اورخرابیاں ہیں اُن کو دورکروتویہ فراموش کردیتے ہیں کہ اُن کے آبائی مذہب کے نقائص کسی بہترمذہب کے اُصول کی روشنی میں ہی نظر آسکتے ہیں۔ مثلاً ہندومذہب میں اچھوت کا نقص موجود ہے ۔ اس نقصر کو مسٹرگاندھی ایک بدنما داغ مانتے ہیں۔ لیکن یہ نقص مسیحیت کے اصول کی روشنی میں ہی نقص نظرآنے لگا ہے۔ ورنہ ہزارہا سال سے یہ ہندومت کی ایک خوبی تصورکی جاتی تھی۔ لیکن جہاں "بہتر" ہے۔وہاں لازم ہے کہ اس سے کم درجہ کی شے موجود ہے"۔ جب کامل آئیگا توناقص جاتارہے گا"(۱کرنتھیوں ۱۳: ۱۰)۔ اس صورت میں مسٹر گاندھی کا یہ خیال باطل ہوگا کہ تمام مذاہب یکساں طورپرصحیح اوردرست ہیں۔ مختلف مذاہب علی الترتیب اپنے اپنے اصولوں کی خوبیوں اورخرابیوں کی بناء پر تقسیم کئے جائیں گے۔ جس مذہب میں زیادہ خرابیاں ہوں گی اُس مذہب کا پایہ کم ہوگا اورجتنی خرابیاں زیادہ ہونگی اتنا ہی اُس کا پایہ کم ہوگا۔ اورجس مذہب میں خوبیاں زیادہ ہوں گی۔ اس مذہب کا پایہ بڑا ہوگا۔ اورجتنی خوبیاں زیادہ ہونگی اس کا پایہ اتناہی بڑا ہوگا۔ اور عالمگیر مذہب وہ ہوگا جس میں خدا کا تصورنہایت صاف اور واضح طورپر اعلیٰ ترین اخلاقی مطمح نظر پر مبنی ہوگا۔ اورجس میں اخلاقیات کا تصوراعلیٰ ترین حالت میں موجود ہوگا۔دریں حال تمام مذاہب یکساں طورپرکس طرح صحیح اوردرست ہونگے؟

۶

چونکہ ہمارے ملک میں قومیت اوروطن پرستی کا جذبہ غالب ہے۔ لہذا ہمارے ہندوستانی بھائی گاندھی جی کی تقلید میں چاہتے ہیں کہ وہ کسی بدیشی مذہب کے بانی کو خدا کا اعلیٰ ترین مظہر ماننے کے بجائے اپنے دیس کے کسی ہیرو کومانیں۔ پس ہندوستان کی نئی پود نے کرشن مہاراج کو سیدنا مسیح کے بجائے خداکا اوتارمان لیا ہے۔

یہ امر بہت اشخاص کے لئے حیرانی کا موجب ہے کہ جس ملک میں آہمسہ کی تعلیم عام ہے اورمہاتما گاندھی جیسے ستیا گراہی پیدا کرتا ہے ۔ اس کے باشندے کرشن مہاراج کو جوجنگ جُوسپاہی تھے اپنا قومی ہیرو کس طرح مان سکتے ہیں اورگیتا کو جوجنگ وقتل کا سبق پڑھاتی ہے اپنی مذہبی کتاب کس طرح قبول کرسکتے ہیں؟ہندوستان کوقدیم برہمنوں کے علم اورفلاسفروں کی دویا پرناز ہے۔ لیکن ہمارے ہندو نوجوان ان میں سے کو اپنی قومی ہیرو نہیں مانتے۔ ہمارے رسالہ نورالہدیٰ کہ حصہ اول سے ناظرین پریہ ظاہر ہوگیا ہوگاکہ بُت پرست اورمذاہب اوربُت پرست ممالک کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی قومی ہیرو کو دیوتاؤں کی صفات سے متصف کردیتے ہیں۔ یہی حال کرشن مہاراج کے ساتھ کیا گیا ہے۔ آپ ہندوؤں قومی ہیرو تھے اوراب اوتارہیں۔ ان کے اوتارہونے کا نظریہ اہل ہنود کے مذہب کا جزو نہیں بلکہ وہ ایک ثقافتی پہلو رکھتا ہے ۔ لہذا وطنیت کے لئے اہم ہوگیا ہے ۔ چونکہ غیر ہنود نے کرشن پر بطور ایک اوتار کے حملے کئے ہیں ۔ لہذا قومی خودداری اوروقارکوقائم رکھنے کے لئے کرشن کے اوتارہونے کی حیثیت کی اہمیت روزافزوں کرتی گئی ہے حتیٰ دورِحاضرہ میں برند ابن کا خوش گلو لڑکا اورکوروکشتر کے میدان کا سپاہی اب اہل ہنود کے دلوں میں گھر کرگیا ہے۔ اوروہ غریبوں کا دوست" مصیبت زدوں کا حامی اورگرے ہوؤں کا نجات دینے والا ہے بن گیا ہے۔ پس جس نسبت سے ہمارے نوجوان ہندومذہب کے اصول ورسوم کوترک کربیٹھے ہیں اسی نسبت سے وہ کرشن کو اپنا قومی ہیرواورخدا کا اوتارسمجھتے ہیں ۔

بقول شخصے - پیرمن خس است واعتقاد من بس است

وہ یہ فراموش کردیتے ہیں کہ انسانی فطرت ہرملک وقوم میں ایک ہی ہے۔ملک اورقوم ذات اورنسل کی امتیازات محض عارضی اورسطحی ہیں۔ لیکن سرشتِ انسانی ہرزمانہ قوم ملک اورنسل میں ایک ہی ہے۔ پس اہم سوال یہ نہیں کہ خدا نے کس قوم یا ملک میں اوتارلیا ہے کیونکہ خدا کے تجسم کا بیرونی حالات سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ۔ خواہ وہ حالات آرین نسل سے متعلق ہوں اورخواہ شامی نسل سے اورخواہ منگولی نسل سے متعلق ہوں۔ہماری غرض اوتارکے اندرونی حالات سے ہے۔ لازم یہ ہے کہ جوخدا کا اوتارہے وہ نوع انسانی کے لئے ایک کامل اوراکمل اورخوبصورت ترین نمونہ ہو۔ اوراس کے کیریکٹر کی خوبصورتی اپنے روحانی کمال کی وجہ سے

ہمارے دلوں کو متاثر کرے۔ اورہر ملک وقوم کا انسان اس نمونہ کو دیکھ کرپہچان جائے کہ فی الحقیقت وہ خدا کا کامل مظہر ہے۔

حق تو یہ ہے کہ انسانی نیکی کسی خاص ملک یا آب وہوا میں نہیں پھلتی پھولتی بلکہ ہر ملک وقوم ونسل میں پھل پھول سکتی ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ ایشیا میں ایک خاص قسم کی نیکی ہوتی ہے۔افریقہ میں دوسری قسم کی اوریورپ میں تیسری قسم کی نیکی ہوتی ہے۔ ہر ملک وقوم کی مقدس ہستی بحیثیت انسان ہونے کے باقی اقوام وممالک کے لئے قابل تعریف اورقابل تقلید ہوتی ہے۔ کرشن مہاراج کا جوکیریکٹر ہم کو پرانوں اورتنتروں میں دکھایا جاتا ہے وہ قابل تعریف وتقلید نہیں ہے۔لیکن اس کے برعکس مسیح کا کیریکٹر اپنے اوج اوردلفریبی کی وجہ سے ہر ملک وقوم ونسل کے انسانوں کا نصب العین ہوگیا ہے۔ مشرق ومغرب ، ہندوستان ، چین وجاپان افریقہ اورامریکہ کے باشندے سب قائل ہیں کہ اگر خدا کا تجسم ممکن ہوسکتا ہے تووہ سیدنا مسیح میں مجسم ہوا ہے۔جس طرح دنیا کے تمام ممالک میں آفتاب کی روشنی یکساں ہے اورہر ملک وقوم ونسل کا شخص جواندھا نہیں وہ روشنی کوجانتا اورمحسوس کرتا ہے اُسی طرح ہر ملک وقوم وزمانہ اورنسل کے انسان مسیح کو خدا کا کامل مظہر جان سکتے ہیں۔لیکن کل دنیا کے انسان تویک جارہے خودہندوستان کے باشندے کرشن مہاراج کواوتارنہیں مانتے۔ ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ دونوں اوتاروں میں بعد المشرقین ہے۔ کرشن مہاراج کا اوتارہونا ہمارے ابنائے وطن کی قوتِ متخیلہ پر انحصار رکھتا ہے ۔ ہندووطن پرست کہتے ہیں:

فسانے اپنی محبت کے سچ پر کچھ کچھ
بڑھابھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

سیدنا مسیح کا اوتار اورمجسم خدا ہونا آنخداوند کی ذات وصفات کی تواریخی حقیقت اورصداقت پر مبنی ہے۔ قوتِ متخیلہ کی بناء ریت کی طرح ہے جس پر اگر کوئی عالیشان عمارت کھڑی کردی جائے توجب شکہ وشبہ کے طوفان اٹھتے ہیں اورعقلی اورمنقولی دلائل کی آندھیاں چلتی ہیں اوراس عمارت پر ٹکریں لگتی ہیں تواس عمارت کوصدمہ پہنچتا ہے اوروہ گرکر برباد ہوجاتی ہے۔لیکن تواریخی حقیقت کی بناء چٹان کی طرح ہے جس پر اگرکوئی عالیشان عمارت قائم کردی ہے تواس کوکبھی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ پس جتنا ایک واضح تاریخی حقیقت اورمحض تخیل میں فرق ہے اتنا ہی سیدنا مسیح اورکرشن مہاراج میں فرق ہے۔

ہم اس بات کوایک موٹی مثال سے واضح کردیتے ہیں۔ جب ہمارے ابنائے وطن نے دیکھا کہ مسٹر گاندھی اپنے نصب العین اورمقصد کوپورا کرنے کے لئے ہر طرح کا دکھ اوراذیت برداشت کرنے اورجسمانی قربانی کرنے کونہایت خوشی اوررضامندی کے ساتھ تیار ہیں اوراپنے دشمنوں کے ساتھ محبت اورعدم تشدد کی تعلیم دیتے ہیں تووہ فوراً بول اٹھے کہ گاندھی جی اس زمانہ کے مسیح ہیں۔اُنہوں نے آپ کے اقوال اورافعال کی نظیر کرشن مہاراج یا ہندوستان کے غیر مسیحی مذاہب کے کسی ہیرومیں نہ دیکھی۔بلکہ سیدنا مسیح کی تعلیم، نمونہ ، اذیت ، قربانی ایثار اورصلیب میں ہی دیکھی۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کے مقدمہ اورسزا کا مقابلہ تمام مسیحی اور غیر مسیحی اخباروں میں سیدنا مسیح کے مقدمہ کے ساتھ کیا گیا۔ ۱۹۲۳ءکی سالانہ انڈین نیشنل کانگرس کے پریزیڈنٹ مرحوم سی آر داس نے اپنے خطبہ میں انجیل متی کے آخری ابواب میں سے بہت سے اقتباسات پیش کئے۔اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسان مسٹرگاندھی کی عزت کرتے ہیں ۔ لیکن اس عزت کا اظہارکرتے وقت ہمارے ابنائے وطن گاندھی جی کوحضرت محمد یاکرشن مہاراج یا بدھ مہاراج کی مانند قرارنہیں دیتے بلکہ سیدنا مسیح کی مانند قرار دیتے ہیں ۔ اگر رام یا کرشن وغیرہ میں اورمسیح درحقیقت فرق نہیں تو وہ کیوں نہیں کہتے کہ مہاتما جی رام یا کرشن وغیرہم کی مانند ہیں ؟ وہ اپنے دلوں میں اس بات کے قائل ہیں کہ گاندھی جی کو ان کی مانند قرار دینا درحقیقت گاندھی جی کی بے عزتی کرنا ہے۔اسی طرح جب پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۳۷ء میں لاہورتشریف لائے تو لاہور کے نوجوان قوم پرستوں نے آپ کو ۱۷ جنوری کے روزکانٹوں کا تاج پیشکش کیا۔ جوآپ نے بڑی انکساری سے قبول بھی کیا۔جس سے ظاہر ہے کہ کانٹوں کا تاج پیش کرنے والوں کے دلو نمیں یہ احساس تھا کہ سیدنا مسیح کی زندگی ہماری قوم کے مایہ نازرہبر کے لئے ایک نمونہ ہے۔ اس طرز عمل سے ہمارے کروڑوں ہم وطن اقرارکرتےہیں کہ سیدنا مسیح کی شخصیت ہندودھرم اوردیگر غیر مسیحی مذاہب کے دیوتاؤں اوربانیوں سے اعلیٰ اورارفع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند کی ذات قدسی صفات ایک حقیقت پر مبنی ہے۔ اورآپ تمام دنیا کے مطمع نظر ہیں۔ لیکن دیگر بانیاں مذہب کی شخصیتیں انسان کی قوت متخیلہ کی دست نگر ہیں۔ دیگر حضرات کی ہستیاں انسانی قوت متخیلہ کی طرف دیکھتی ہیں ۔ لیکن انسانی قوتِ متخیلہ سیدنامسیح کی ہستی کی طرف دیکھتی ہے تاکہ پروازکرسکے

ہم خوبان عالم رابزیورہا بیا را یند
تو یسمین تن ہستی کہ زیور یارابیارائی

۷

علاوہ ازیں سودیشی مذہب کے شیدائیوں کو یادرکھنا چاہیے کہ :

بنی آدم اعضائے یکدیگراند

مختلف اقوام کے اختلافات عارضی ہیں اوران میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ کالے اور گورے چینی اورجاپانی۔ امریکی اور افریقی۔ عجمی اور عربی وغیرہ وغیرہ تمام اقوام نوع انسانی کی مختلف شاخیں ہیں ۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ وہ مختلف مقامات میں آباد ہیں۔ ان کے قومی اختلافات محض عارضی اورسطحی اختلافات ہیں۔ ہر شخص کی سرشت انسانی ہے اورانسانی فطرت ہرجگہ ایک ہی ہے۔ اس کی روحانی ضروریات ہر ملک زمانہ اورقوم میں ایک ہی ہیں۔مذہب کے معاملہ میں جائے پیدائش اورجنم بھومی کودخل نہیں بلکہ نئی پیدائش اورنئے جنم کودخل ہے۔ انسان کے بے لگام ارادے ، بری خواہشات گناہ روحانی موت وغیرہ کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں بلکہ گناہ ایک عالمگیر بیماری ہے جس کا علاج بھی عالمگیر ہے ہم ہندوستان کے اہل ہنود سے پوچھتے ہیں کہ اگرہرملک کا مذہب اس ملک کے باشندوں کے لئے کافی اوروافی ہے توتم امریکہ اوریورپ میں لوگوں کو کیوں بھیجتے ہوتاکہ وہاں رام کرشن اورویدانت کے خیالات کا پرچارکریں؟ اوروہاں کے لوگوں کو کیوں ہندو طریقہ خوراک بودوباش وغیرہ پرراغب کرکے اُن کے آبائی مذہب سے اُن کو روگردان کرتے ہو۔ چنانچہ سری شنکر اچاریہ ڈاکٹر کرت کوٹی نے لاہورمیں اکتوبر ۱۹۳۶ء کے ہندومہاسبھا کے سالانہ جلسہ کے خطبہ صدارت کے دوران میں فخریہ کہا تھا:

میں نے گذشتہ سالوں کے دوران میں چند انگریز فرانسیسی اورامریکن خواتین کوہندومت میں شامل کیا ہے اورمیں خوشی سے یہ کہتاہوں کہ وہ ہندوستان کے ہندو عورتوں سے کسی بات میں پیچھے نہیں ہیں"۔

آگیا داغ ان کے دل میں غرور
شکل ہے دنیا میں لاثانی میری

پس ہم سودیشی کے اصول کو روحانی اُمورپرعائد نہیں کرسکتے کیونکہ انسانی روح کے میلانات اوررحجانات زمان ومکان یا ملک اورقوم کی قیود میں جکڑے نہیں ہوتے۔ہندوستانیوں کی روحوں کے تقاضے بیعنہ وہی ہیں جودیگرممالک کے باشندوں کی روحوں تقاضے ہیں۔مذہب جغرافیہ کی حدود کی چاردیواری میں مقید نہیں ہوتا۔

اس کا دائرہ اثر اس قسم کی مصنوعی زنجیروں کا پابند نہیں ہوتا۔لفظ سودیشی مذہب محض بے معنی ہے۔کیونکہ مذہب کا تعلق انسانی سرشت اورانسانی فطرت کے ساتھ ہے جس کی ضروریات ہرملک زمانہ قوم اورملت میں ایک ہی ہوتی ہیں۔ اگرکوئی روحانی اصول ایسا ہے جوانسانی فطرت کے تقاضاؤں کو بدرجہ غایت پورا کرتا ہے اوروہ ہمارے ملک کا نہیں ہے توکسی صاحبِ عقل کا یہ کام نہیں کہ ایسے گرانما یہ درِنایات کومحض سودیشی اصولِ وطنیت کی خاطر پھینک دے اوراپنے ابنائے وطن کو اس کے فیوض سے محروم کردے۔ ایسے طریقہ کار سے ہم ہندوستان پر روحانی ترقی کا دروازہ بند کردینگے۔

۸

بعض برادران وطن اپنے خودساختہ اصول رواداری کے اس قدر شیدائی ہوجاتے ہیں کہ جس چیزکو وہ اپنے دلوں میں مکروہ اورغلط جانتے ہیں اس کی حمایت میں عام پبلک کے روبرو رطب للسان ہوجاتے ہیں اوراپنی ضمیرکو یہ سمجھا کر خاموش کردیتے ہیں کہ وہ مکروہ بات اُن کی روایات کا جزو ہے۔مثلاً تعلیم یافتہ اورروشن خیال انسان بُت پرستی کوباطل اورمرُدود خیال کرتے ہیں۔لیکن جب کبھی پبلک کے سامنے اس کا ذکر ہوتا ہے۔ تووہ بے سروپاتاویلیں کرنی شروع کردیتے ہیں۔ جب وہ اپنے گاؤں میں جاتے ہیں توبُت پرستی اوردیگر رواہیات رسوم میں شریک ہوتے ہیں ۔ اگرچہ وہ دل میں ان کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں۔ لیکن اپنی ضمیرکو یہ کہہ کر خاموش کردیتے ہیں کہ یہ رسوم بد اُن کے آباواجداد کی قومی روایات کا جزولاینفک ہیں۔ لہذا ان میں شریک ہونا ہرج کی بات نہیں۔ان کا یہ معیار ہے کہ

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو

لیکن یہ معیار سراسر غلط ہے۔گویہ معیار بھاگوت گیتا کا ہے چنانچہ کرشن جی کہتے ہیں:

" جس راہ پر بزرگ چلیں اورجودستوروہ بنائیں۔ عوام کو لازم ہے کہ وہ اسی کے پابند ہوں" (۲۱:۳)۔

یہ تعلیم یافتہ اشخاص یہ خیال نہیں کرتے کہ بقول مرحوم لارڈ مارلے اس قسم کے منافقانہ رویہ سے وہ اپنے ملی اورجماعتی رسوم کی اصلاح اورملک کی حقیقی فلاح کا دروازہ بند کردیتے ہیں۔

۹

دورِ حاضرہ کی نوجوان پشت قوم کی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جونہی وہ اصلاح کرنی چاہتے ہیں ہندومت اُن کی

مساعی جمیلہ میں سنگ گراں ہوکر سدراہِ ہوجاتا ہے۔پس قوم کے مصلحین کے لئے لازم تویہ ہے کہ وہ ہندومت کوراستہ میں سے ہٹادیں تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکیں۔لیکن اس کے برعکس ان کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ہندومت ہمارے رشیوں کا مذہب ہے وہ ہمارا آبائی مذہب ہے۔ وطن کے سودیشی مذہب کوترک نہ کرو۔مثلاً اچھوت اُدھار کا سوال لے لو۔جب سے برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلہ میں اچھوتوں کے ہندوؤں سے الگ شمار کیا ہے۔ تب سے مسٹر گاندھی اوران کے رفقا اس فکر میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اچھوت ہندوؤں سے الگ نہ ہوں تاکہ ہندوؤں کی ضعف نہ پہنچے۔ پس اُنہوں نے اچھوت ذاتوں کو اٹھانے کا پراپگینڈہ کیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے بڑی سے جو اچھوت ادھار کی راہ میں حائل ہے۔وہ ہندوؤں کا کرم اصول ہے۔ جب تک یہ اصول ہے۔ جب تک یہ اصول ہندوستان میں مانا جائیگا۔ اچھوت ادھار کی تمام کوششیں بے سود اور بے کار ثابت ہوں گی۔ کیونکہ ان دونوں میں علت ومعلول کا تعلق ہے ۔ پس اگرہم اچھوت ذاتوں کو اٹھانا چاہتے ہیں توہمیں لازمی طورپر کرم کے اصول کوترک کرنا ہوگا۔ جس طرح ہندوستان کے مسیحیوں نے ترک کرکے ان صحیح ذاتوں کو اوپر اٹھایا ہے۔ لیکن جائے حیرت یہ ہے کہ مسٹر گاندھی مسیحی کلیسیا کو اس کارِخیر کے لئے کوستے ہیں اورمسیحی مبلغین کو ملک بدرکرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ حالانکہ قوم کی شیرازہ بندی صرف مسیحی اصول پر عمل کرنے سے ہی ہوسکتی ہے۔

۱۰

ہم کویہ امر ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وطنیت اورسودیشی کا اصول جب حد اعتدال سے تجاوزکرجاتا ہے تومنافرت اورمناقشت کا پودا پھلنے پھولنے لگتا ہے۔ اس قسم کے اصول کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک وطن اورقوم کی اس قدرپرستش کرنے لگ جاتے ہیں کہ دیگر ممالک واقوام کے انسانوں اورچیزوں کو"بدیشی" سمجھ کر ان کو حقارت اورنفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتے ہیں ۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ بعض اوقات مجنونانہ جوش میں قوم پرست نوجوان دوسروں کی جان لینا بھی فرض سمجھ کر اُن کو بے دریغ قتل کردیتے ہیں ۔اوراپنی جان کوقومیت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانا اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔قتل اورخون ان کی نگاہ میں ایک مقدس فرض نظر آتا ہے۔ اوردیگر وطن پرست قاتل کو غازی اورشہید کے معزز القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ خود ہمارے

ملک میں بیسویں صدی کے اوائل میں قومیت اوروطن پرستی کے جذبہ سے سرشار ہوکر نوجوان دوسروں کو قتل کرتے رہے۔کیونکہ دوسرے ان کے فعل کو بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ ابھی چند سال ہوئے آہمسہ اورعدم تشدد کے رسول مسٹر گاندھی قاتل بھگت سنگھ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔اگرچہ وہ اس کے فعل کو بُرا سمجھتے تھے۔

مملکت رادین اومعبود ساخت
فکر اومذموم رامحمود ساخت

یہ سچ ہے کہ گاندھی جی عدم تشدد کی تلقین کرتے ہیں اوراس اصول پر خود عمل کرتے ہیں۔ لیکن عدم تشد کا اصول قومیت کے مذہب یا وطنیت کا اصل الاصول نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک خارجی اصول ہے ۔ جو غیرہندو مذاہب بالخصوص مسیحیت سے (جس کا وطن پرستی سے تعلق نہیں)اخذ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم پرست بالعموم اس اصول کو وطنیت کے مذہب کی بنیاد نہیں مانتے۔حقیقت تویہ ہے کہ وطنیت کے مذہب میں وہ اخلاقی طاقت موجود نہیں جوتشدد کوایک مذسوم شے قرار دینے پر اصرار کرے۔اوریہ خدشہ رہتاہے کہ وطنیت کا مذہب ہماری انسانی سرشت کے میلانات اوررحجانات کوسیدھے رستہ پر رکھنے کی بجائے ان کو برگشتہ کردیگا اورملک وقوم کوسدھارنے کی بجائے ان کو بگاڑدیگا۔ موجودہ زمانہ میں قومیت سے یہ مطلب لیا جاتاہے کہ قوم ایک وجود مطلت ہے اورتمام چیزیں اسکے ماتحت ہیں۔یہ تعلیم نئے بھیس میں وہی پُرانی تعلیم ہے جس کا مقابلہ مسیحیت نے اوائل صدیوں میں کیا تھا کہ قیصر خداہے۔ اس نئی تعلیم کا یہ مطلب ہے کہ وطن کی سیاسیات انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حکمران ہے اورالہٰی شرائع اورمذہبی احکام سب اس کے ماتحت ہیں۔یہ عہد حاضر کا دجال ہے اوربُت پرستی کے برابر ہے۔ کیونکہ اس طورپر قوم خدا کی سلطنت سے بالا اورخالق کی مرضی ارادہ اورمنشا پر مقدم قراردی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگیاہے کہ فی زمانہ جس ملک (مثلاً جرمنی، اٹلی وغیرہ) میں یہ تعلیم غالب ہوتی ہے وہاں نہ صرف مذہبی آزادی بلکہ ہرقسم کی آزادی نابود ہوجاتی ہے۔ وطنیت اورقومیت خدا کی برتری اوراس کے قوانین کی عالمگیری کا انکارکرتی ہے تاکہ خدا کی جگہ کوغصب کرکے اپنے قوانین کوانسانوں پر حاوی کرسکے وطنیت کے اُصول قومیت کوخدا اورمذہب پر حکمران کردیتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں مذہب کوقومیت پر حکمران

ہونا چاہیے۔تاکہ مذہب قوم کی حالت کوسدھارسکے اورقوم شاہرہ ترقی پرگامزن ہوسکے۔

۱۱

اگرسودیشی اصول کا مذہب پر اطلاق کیا جائے تواس کا لازم طورپر منطقی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ سودیشی مذہب یاوطنیت کے ماننے والے اس بات کے قائل نہیں کہ کل بنی آدم ایک ہی اصل اورخون سے پیدا ہوئے ہیں۔ اورایک دوسرے سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں جومنکشف اعضا کوایک ہی بدن سے ہوتا ہے۔ اس مسلمہ اُصول کا انکارلازمی ہے کہ ع بنی آدم اعضائے دیگر ندا مرحوم اقبال نے کیا خوب کہا کہ:

آنچناں قطع اُخوت کردہ اند
بروطن تعمیر ملت کردہ اند
تاوطن راشمع محفل ساختند
نوع انسان راقبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی ازآدمی بیگانہ شُد

چونکہ اس نظریہ کی رُوسے قوم کی بنیاد وطن ہے۔ لہذا ہم کو یہ ماننا پڑیگا کہ رنگ نسل قوم اورذات وملک کے اختلافات سطحی اورعارضی نہیں۔ بلکہ اصلی حقیقی اوربنیادی اختلافات ہیں۔ لیکن فی زمانہ کون صحیح العقل شخص اس قسم کے نتیجہ کو مان سکتا ہے ؟ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منطقی نتیجہ عقل کے خلاف ہےلہذا باطل ہے۔پس نتیجہ کی بطالت یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ قضا یاجن کی بناء پر اس قسم کا نتیجہ قائم ہے درحقیقت باطل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سودیشی اُصول کا مذہب پر اطلاق نہیں کرسکتے۔ اُصول منطق کے مطابق ضدین میں سے اگرایک قضیہ باطل ہوتودوسرا صحیح ہوتا ہے۔ پس یہ ظاہر ہے کہ مذہب کے اصول کی صحت وبطالت کا تعلق کسی خاص ملک قوم رنگ یانسل کے ساتھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اگرکوئی اُصول مذہب درست ہے توکل مملاک واقوام وازمنہ اورتمام بنی نوع انسان کے لئے درست ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں وطنیت کا مذہب درحقیقت نسل اورخون کے اُصولوں پر مبنی ہے ۔ یہ اُصول کسی ایک قوم کی نسل کودیگر اقوام کی نسل پر فوقیت دیتے ہیں۔ اوریہ تعلیم دیتے ہیں کہ مختلف نسلوں کے خُون کی ملاوٹ نسل کی تنزلی کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً بعض آرین نسل کو دیگر اقوام کی نسلوں پر ترجیح دیتے ہیں۔چنانچہ بھاگوت گیتا میں جب ارجن کرشن جی کو کہتا ہے کہ میں اپنے عزیزواقارب سے

جنگ کرنا نہیں چاہتا توکرشن جی اس کو ملامت کرتے ہیں اورجنگ پر اُس کو یہ کہہ کرآمادہ کرتے ہیں :

" اے ارجن جنگ میں سستی کرنا آرین نسل کےشانِ شایان نہیں"۔

(۲: ۳" مترجمہ مسز اینی بسنت)۔

ایسے لوگ اس بات پر اصرارکرتے ہیں کہ اس نسل کے انسانوں کو کسی دوسری نسل کے انسانوں سے شادی بیاہ کے تعلقات نہیں رکھنے چاہیں۔کیونکہ اس طرح مخلوط ہوکر نسل کا خون خراب ہوجاتا ہے اورنسل ترقی کرنے کی بجائے تنزلی کی طرف مائل ہوجاتی ہے۔لیکن جوشخص بیالوجی یاعلم الحیات سے ذرا بھی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ نسل اورخون کے یہ اُصول غلط ہیں اورنوع انسانی پر عائد نہیں ہوسکتے۔ انسان اورحیوان میں فرق یہی ہے کہ حیوان کی نوع نسل اورخون کے اصولوں پر قائم ہے لیکن انسانی نوع جوذی روح ہے روحانی اصولوں پر قائم ہے جن کا تعلق نسل اورخون جیسی مادی اشیاء سے نہیں ہوتا۔

انجیل جلیل کی تعلیم اس بارے میں نہایت صریح اورواضح ہے۔

" خدا نے سب قوموں کو روئے زمین پر رہنے کے لئے ایک ہی خون سے پیدا کیا (اعمال ۱۷باب ۲۶آیت)۔

اقوام عالم میں اختلافات ضرورہیں۔ لیکن وہ محض سطحی اختلافات ہیں۔ لہذاان کے باوجود کل بنی نوع انسان ایک ہیں۔ کسی انسان کو انسانیت کے رنگ یا ملک یاقوم یااس کی تمدنی اقتصادی یا سیاسی حالت پر مبنی نہیں بلکہ اس کی انسانیت اس بات میں ہے کہ خالق کائنات نے اس کو پیدا کیا ہے(لوقا ۳: ۳۸۔ پیدائش ۱: ۲۶۔ رومیوں ۱۰: ۱۲ وغیرہ)۔ اورخدا" کسی کا طرف دارنہیں بلکہ ہر قوم میں جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اورراستبازی کے کام کرتا ہے وہ خدا کوپسندآتا ہے(اعمال ۱۰: ۳۴)۔پس کوئی شخص خواہ کسی ملک قوم، ذات یانسل کا ہو"(نجس اورناپاک نہیں (اعمال ۱۰: ۲۸)۔کیونکہ سب بنی آدم ایک ہی آسمانی باپ کے فرزند ہیں (متی ۵: ۴۵ وغیرہ)

اُن کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

وطنیت یاسودیشی مذہب کے اصول اقوام عالم کو اپنے اپنے ملک کی چاردیواری کے اندرمحدود کردیتے ہیں۔ لہذا وہ بین الاقوامی

تعلقات کے قیام اورترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔یہ امر مزید
توضیح کا محتاج نہیں کہ بنی نوع انسان کی ترقی بین الاقوامی تعلقات
کے نشونما پانے اوراقوام وممالک کے افراد کے باہمی میل ملاپ
اُخوت اورمحبت پرمنحصر ہے اورہم وطنیت کے سودیشی مذہب
کے اصولوں کومان کر مختلف ممالک کی اقوام کوجغرافیائی حدود
کے اندررکھ کر باہمی میل جول کی راہ بند کردیتے ہیں ۔ ہمارا ملک
صدیوں سے اس قسم کی مصنوعی پابندیوں میں پابزنجیر رہاہے۔
جس کا نتیجہ یہ ہواہے کہ ہندی قوم دیگر اقوام سے الگ تھلگ اپنی
زندگی بسر کرتی رہی ہے۔ اوراتفاق اورمحبت واُخوت کی بجائے وہ
دیگر اقوام وممالک کے افراد کو نفرت اورحقارت کی نظر سے دیکھتی
رہی ہے اورترقی کرنے کی بجائے تنزلی کرتی گئی ہے۔ وطنیت کے
نظریہ کی رُو سے صرف قومیں باقی رہ جاتی ہیں ۔ آدمیت فنا ہو جاتی
ہے۔ آدمی درندہ اورانسان حیوان ہوجاتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم
کے خون کی پیاسی ہوجاتی ہے۔اُخوت انسانی پارہ پارہ ہوجاتی ہے۔
اقوام میں مخلوقِ خدا ابٹتی ہے اس سے
انجیل جلیل کے اصول کے مطابق ہم ملک یا قوم ذات نسل یارنگ
کے اختلافات کوبنیادی اورحقیقی اختلافات قرار نہیں دے سکتے۔
چوکنہ خدا ایک ہے لہذا کل بنی نوع انسان بھی ایک ہی اصل سے ہیں
اورخدا کے فرزند ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔خدا کا کوئی
مخلوق فی نفسہ پیدائش یاذات یاقوم یانسل کی وجہ سے دوسرے سے
بالا یا برتریا کمتر نہیں۔ خدا کا کوئی منظورنظر نہیں اورنہ خدا کسی کا
طرفدار ہے۔آسمانی باپ کے خاندان میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک فرزند
اس کی بادشاہی کا وارث ہو اوردوسرا محروم الارث ہوبلکہ کل بنی
نوع انسان خواہ وہ کسی ملک قوم یا نسل کے ہوں یکساں طورپر خدا
کی بادشاہت کے وارث ہیں۔

جولوگ مسٹر گاندھی کی طرح نسل انسانی کومختلف اقوام
میں منقسم کرکے اورسودیشی کے اُصول کا اطلاق کرکے معرفت الہٰی
کوکسی خاص ملک یاقوم یاذات کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں وہ
یقیناً خدا کی وحدانیت کے قائل نہیں اوراس کی ذات وصفات اوراس
کی نجات کے علم سے بے خبر ہیں۔ ہندومت کروڑوں دیوتاؤں کا قائل
ہے۔ لہذا اس کے پیرواس قسم کی خطرناک غلطی میں مبتلا ہوسکتے
ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے خدائے واحد کی محبت کا جوخداوند ہے
میں بنی آدم پر ظاہر ہوئی ہے تجربہ کیا ہے وہ اس چاہ ضلالت سے
نکل آئے ہیں اوراُن کا یہ ایمان ہے کہ خدا جودلوں اورگردوں کا جاننے

اورپرکھنے والا ہے وہ ہرکس وناکس کو اوربالخصوص ہرقوم وملک کے گنہگاروں اوربدکاروں کو اپنی بے قیاس محبت سے نجات کی دعوت دیتا ہے۔

۱۳

جن لوگوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ بعض مذاہبِ باطلہ یہ مانتے ہیں کہ ہرایک ملک کاایک خاص دیوتا ہے ۔ جس کا اختیار اُس ملک کی چاردیواری تک ہی محدود رہتا ہے اوربیرونجات پر اُس کا قبضہ نہیں ہوتا۔ ان مذاہبِ باطلہ کے مطابق ہرایک ملک کا دیوتا اس ملک پر حکمران ہوتا ہے۔ پس اس ملک کے باشندوں کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ صرف اُسی دیوتا کی پرستش کریں اورآس پاس کے ممالک کے دیوتاؤں کی پوجا نہ کریں۔وطنیت اورسودیشی مذہب کے ماننے والوں کی ذہنیت بعینہ ان مذاہبِ باطلہ کے پرستاروں کی سی ہے۔ جس طرح وہ یہ مانتے ہیں کہ ہر ملک کے باشندوں کوچاہیے کہ صرف اپنے ملک کے معبود کی پرستش کریں۔ اسی طرح وطنیت یاسودیشی مذہب کے شیدائی مانتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے ملک وقوم کے معبود کی پرستش کرنی لازم ہے۔اوراس قسم کی ذہنیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ممالک کے مختلف دیوتا ہوتے ہیں۔اوریہ تمام دیوتا اپنی اپنی جگہ برحق اوراپنے اپنے ملک میں یکساں طورپر صاحبِ اختیار اوراپنے اپنے ملک کے باشندوں کے مال وجان پر قابض سمجھے جاتے ہیں۔پس خدا کی وحدانیت کی بجائے خداؤں کی کثرت کو ماننا لازم آتا ہے اوردیوتا پرستی خدا پرستی کی جگہ لے لیتی ہے۔لیکن جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ خدا ایک ہے وہ اس قسم کی بُت پرستی کے ایمان کو مردود سمجھتے ہیں۔

علم الحیات کا مشہور پروفیسر جے ۔ ایس ۔ہکسلے کہتاہے:

"فطرت کی وحدت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ مذہب بھی ضرور ایک عالمگیر شے ہے۔ اورجس طرح فطرت ہر جگہ ایک ہے اسی طرح ایک ہی مذہب سب پر حاوی ہونا چاہیے ۔ صرف ایک واحد عالمگیر مذہب ہی اس قابل ہوسکتاہے کہ مختلف اقوام عالم کوایک لڑی میں پرودے[13]۔

پس نہ صرف خدا کی وحدت ہم کو اس بات پر مجبورکرتی ہے کہ ایک عالمگیر مذہب کی ضرورت کو مانیں بلکہ سائنسدان بھی ڈنکے کی چوٹ یہی اعلان کرتے ہیں کہ فطرت کی وحدت اس بات کو منوانے پر ہمیں مجبور کرتی ہے کہ کوئی نہ کوئی مذہب عالمگیر ہو۔

---

13 J.S.Huxely, Essays of a Biologist, pp.301-302

مسیحی نجات کا اصول اس بات پر زوردیتا ہے کہ مسیح کل بنی نوع انسان کے لئے موا۔ پس نہ صرف انجیلی ایمان کہ خدا ایک ہے ہم کو اس بات پر مجبورکرتا ہے کہ ہم نوع انسانی کوایک مانیں۔ بلکہ مسیحی نجات کا اصول بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے ۔ منجئی عالمین کی صلیب کے سایہ کے نیچے ہرقسم کی مصنوعی امتیازات اورعارضی اختلافات کا خاتمہ ہوجاتا ہے کیونکہ۔کوہِ کلوری پر ہم کو تمام اقوام وممالک ایک جگہ جمع دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں ہرگنہگار خواہ وہ کسی قوم نسل یاذات کاہو خدا کی محبت کا جلوہ دیکھتا ہے ۔ اورہر بدکارخواہ وہ کسی ملک کا ہو توبہ کے ذریعہ ازسر نوزندگی بسر کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ چنانچہ انجیل جلیل میں مرقوم ہے کہ:

" وہی مسیح ہماری صلح ہے جس نے کل اقوام کویک جاکردیا اورجدائی کی دیوارکو جوبیچ میں تھی ڈھادیا" (افسیوں ۲: ۱۰)۔

لیکن ہندومت اس قسم کی نجات کا قائل نہیں ۔ ہندومت کے ذات پاب کے اصول اورمسٹرگاندھی کے سودیشی مذہب وطنیت کے اصولوں نے ملک اورقوم جیسی سطحی امتیازات کو مقدم قرار دے کر یہ ثابت کردیا ہے کہ نوع انسانی کو" نوع" کہنا سخت غلطی میں گرفتار ہونا ہے۔ کیونکہ وہ ایک "نوع" نہیں بلکہ مختلف اورمتضاد گروہوں ملتوں ذاتوں قوموں اور نسلوں کا مجموعہ ہے جوایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں۔ گویا نوع انسانی کا وجود محبت کے لئے نہیں بلکہ باہمی جنگ وجدل کے لئے ہے۔اورنوع انسانی اُخوت ومساوات کی خاطر صفحہ دہرپرظاہر نہیں ہوئی بلکہ باہمی تقسیم اورمنافرت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔وطنیت کے مذہب کے اصول کے مطابق ہر ملک وقوم کے خاص اوصاف ہیں اورکسی ایک ملک یاقوم کی خصوصیتیں دیگرممالک واقوام کے افراد میں موجود نہیں ہوسکتیں۔کیونکہ یہ خصوصیتیں ان ممالک واقوام کے خون میں نہیں ہوتیں۔اوران کی ذات ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ پس وطنیت اورسودیشی مذہب کے اصول کے مطابق روئے زمین کے مختلف ممالک واقوام کے افراد کے درمیان ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جو کسی طرح بھی عبور نہیں کی جاسکتی۔اورجیسا ہم اپر ذکر کرچکے ہیں یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جوہم کو الحاد اورکفر کی جانب لے جاتا ہے۔

ان خطرناک نتائج وعواقب کی وجہ سے مسٹر گاندھی کے جانی دوست مرحوم سی ایف اینڈرو نے ایک دفعہ آپ کو بایں الفاظ متنبہ کیا تھا "آپ کے اس قول سے کہ تمام مذاہب برابر ہیں۔ مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ کیونکہ یہ بات حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔ اورمیرا ذاتی تجربہ بھی اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ آپکا ایمان کہ انسان کو ہمیشہ اپنے آبائی مذہب پر رہنا چاہیے۔ مذہب کو ایک جامداد بے معنی شے بنادیتا ہے۔ حالانکہ مذہب کو زندگی کے ہرشعبہ کا محرک ہونا چاہیے۔ اگرآپ کا یہ خیال درست ہے تو مجھے ہمیشہ رونگ فرقہ کی تنگ حدود میں رہنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میں نے اسی فرقہ میں جنم لیا تھا۔ آپ نے خود کئی بار کہا کہ" اگر اچھوت پن ہندومت کا جزو ہے تومیں ہند ونہیں ہوسکتا"۔ مسیح میرے لئے ایک لاثانی وسیلہ ثابت ہوا ہے۔ جس کے ذریعہ میں نے الہٰی معرفت حاصل کی ہے اورمیں دوسروں کو یہ حقیقت بتلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انجیل کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہے کہ مسیح نے ذات، نسل اوررنگ کی دیواروں کو ڈھادیا ہے اوراس کا پیغام کل بنی آدم کیلئے ہے۔جب کوئی شخص صدقدل سے کسی بات کو مانتا ہے تواس کا اعلان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پولوس رسول کہتا ہے کہ" میں انجیل کی خوشخبری سنانسے پر مجبور ہوں بلکہ مجھ پر افسوس اگرمیں نہ سناؤں"(۱کرنتھیوں ۹: ۱٦)۔ آپ خودآہمسہ کے اصول کا پرچار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب کوئی شخص بپتسمہ پاتا ہے تووہ اپنی قوم اورملک کو ترک نہیں کردیتا۔ بلکہ وہ "شیطان اوراس کے سب کاموں کو دنیا کی واہیات باتوں کو اورنفس کی بڑی خواہشوں کوترک "کرنے کا وعدہ کرتا ہے وہ اپنے ملک اورقوم کی اچھی چیزوں کو ترک نہیں کرتا۔ چنانچہ مقدس پولوس رسول فرماتا ہے"اے بھائیو جتنی باتیں حق ہیں اورشرافت کی ہیں اورواجب ہیں اورجتنی باتیں پاک اورپسندیدہ اوردلکش ہیں غرض جونیکی اورتعریف کی باتیں ہیں۔ان پر غورکیا کروتوخدا جوصلح کا بانی ہے ہمارے تمہارے ساتھ رہے گا"(فلپیوں ۴: ۸)۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوؤں، مسلمانوں اورمسیحیوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ لیکن عقائد کے اختلاف کی بناء پر ہمیں ایک دوسرے کو مطعون کرنے سے پرہیزکرنا چاہیے"(ایپفینی ۳ مئی ۱۹۴۱ء) مرحوم مرتے مرتے گاندھی جی کو وصیت کرگئے ہیں۔

مراد بانصیحت بودوگفتیم
حوالت باخداکردیم ورفتیم

باب پنجم

عالمگیر مذہب کی خصوصیات

سودیشی مذہب عالمگیریت اورقطعیت کے منافی ہے

وطنیت اورسودیشی مذہب کے اُصول سے یہ لازم آتا ہے کہ عالمگیر مذہب کے امکان کا انکارکیا جائے۔اگرہر ملک وہررسمے کی طرح ہر ملک وہرمذہب کا تصوردرست ہے تو یہ ظاہر ہے کہ کوئی مذہب عالمگیرنہیں ہوسکتا۔کیونکہ ہرمذہب اپنے اپنے ملک کے باشندوں کے لئے اپنی اپنی جگہ یکساں طورپر درست اورصحیح ہوگا اوریہ گنجائش ہی نہیں رہیگی کہ کسی مذہب کی اس کے اپنے ملک کے باہر ضرورت ہویا کوئی ایک مذہب ایک سے زیادہ ممالک واقوام پر حاوی ہو۔ ہر ملک کے مذہب کے اصول اس کے باشندوں کے لئے درست ہونگے۔اوراس ملک کی چاردیواری کے باہر وہ اصول ناکارہ ثابت ہونگے۔ پس کوئی مذہب عالمگیرہونے کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ عالمگیر مذہب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے اصول تمام ممالک واقوام وازمنہ کی رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اورکل بنی نوع انسان پر حاوی ہیں۔ وطنیت اورسودیشی مذہب کے اصول زمان ومکان کی قیود میں مقید ہوتے ہیں لیکن عالمگیر مذہب کے اُصول زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔

۲

وطنیت اورسودیشی مذہب کے اصول کے ماننے سے یہ بھی لازم ہے آتا ہے کہ کسی ایک مذہب کی قطعیت کا انکارکیا جائے۔ اگریہ درست ہے کہ ہر ملک وزمانہ کا مذہب اپنی اپنی جگہ برحق ہے تویہ ظاہر ہے کہ کسی مذہب کے اُصول قطعی نہیں ہوسکتے اور نہ کوئی مذہب یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کا مکاشفہ آخری اور حتمی طورپر کامل اوراکمل ہے اوراس اعلیٰ ترین مکاشفہ کے بعدکسی بہترمکاشفہ کا امکان نہ صرف بعید ازقیاس بلکہ محال ہے۔ سودیشی مذہب کے قضایا سے یہ نتیجہ ایسا صاف اورصریح ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ چنانچہ بمبئی کے مشہورہفتہ وارانگریزی اخبارانڈین سوشل ریفارمر کا ہندوایڈیٹر لکھتا ہے:

"بدھ اورکرشن جیسے عظیم الشان استادوں کی تعلیم کو ہمیں قطعی سمجھ کر قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس ہمارا یہ فرض ہےکہ ہم ان کی تعلیم کو ایک قدم آگے بڑھائیں تاکہ نوع انسانی کی اخلاقی اورروحانی ترقی ہو"(فروری ۱۹۴۱ء)۔

اگریہ درست ہے کہ ہر قوم کے لئے اس کا اپنا مذہب کافی سچا اوربرحق ہے تولاکلام ہم اس نتیجہ سے گریز نہیں کرسکتے کہ ہم حقیقت کو قطعی طورپر نہیں جان سکتے۔ ہرشخص کے لئے وہی سچ اورحق ہے جووہ مان لے ۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ درحقیقت سچائی کوئی شے نہیں اورحق کوئی خارجی حقیقت اوروجود نہیں رکھتا۔وہ محض ایک ذہنی شے ہے جس کا انحصارہرشخص کے اپنے خیالات پر ہے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اس قضیہ کو الحاد اورمذہبی اصطلاح میں اس کوکفر کہتے ہیں۔ پر اگرمذہب کا معبود اورمسجود کوئی حقیقی وجود رکھتا ہے تواس کا وجود انسان کے علم سے بے نیاز ہے ۔ جس طرح ہر مادی شے جو خارجی وجود رکھتی ہے اپنے وجود کے لئے انسان کے ذہن کی مرہون منت نہیں ہوتی۔ اب اگر اس معبودِ حقیقی کا علم یقینی طورپر ممکن ہے تویہ ظاہر ہے کہ ایسا حقیقی اوریقینی علم اور کوئی دوسرا ظنی علم دونوں یکجا نہیں ہوسکتے۔ چونکہ ظنی علم میں بطالت کا عنصر ضرورہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ علم ظنی علم ہوتا ہے۔ لہذا ایک برحق مذہب کی موجودگی میں ظنی علم کے مذاہب قائم نہیں رہ سکتے۔ پس تمام مذاہب یکساں طورپر صحیح اورراست نہیں ہوسکتے۔

خدا کا یقینی علم جوہم کو حاصل ہے۔ صرف کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کیلئے راست نہیں ۔ بلکہ کل روئے زمین کی اقوام وممالک کے لئے راست ہے۔ وہ علم ایک ایسی قسم کا ہے جس کا کسی خاص قوم یا ملک پر انحصار نہیں۔اس کو ہم ایک مثال سے واضح کردیتے ہیں ۔ اگرمادی اجسام کے لئے قانون کششِ ثقل کوئی حقیقت رکھتا ہے اوریہ قانونِ ثقل سچ ہے تویہ قانون کسی ایک ملک یازمانہ کے لئے درست اورصحیح نہیں ہوگا بلکہ کل ممالک وازمنہ کے لئے درست اورصحیح ہوگا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ خدا کے علم کی تحصیل مادی اشیاء کے علم کی مانند سہل نہیں۔ لیکن اس اعتراض سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ معرفت الہٰی کوحاصل کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔

ایں سعادت بزوربازونیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن اس اعتراض سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا کی ذات کے متعلق ہرملک وزمانہ کے لوگوں کا علم یکساں طورپر صحیح ہے یہ نرالی منطق ہے کہ دنیاوی علوم مثلاً علم کیمیا، علمِ ریاضی وغیرہ کے اصول تمام زمانوں اورملکوں اورقوموں کے لئے ایک ہوں اورراست

ہوں۔ لیکن معرفت الہٰی کا علم تمام ممالک وازمنہ کیلئے ایک نہ ہو اورراست نہ ہو۔ معرفت الہٰی کی حقیقت کا انکاردرحقیقت ذاتِ الہٰی کی حقیقت کا انکار ہے۔

پس اگرہم ملحدانہ خیالات سے بچنا چاہتے ہیں توہم کو لاکلام ماننا پڑیگا کہ ہم حقیقت کو جان سکتے ہیں اورکہ حق ایک ایسی شے ہے جس کا انحصارکسی خاص فردیا قوم یاملک پرنہیں ہوتا۔بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جو تمام افراد ممالک اوراقوام پرحاوی ہے۔ چونکہ مسٹرگاندھی سودیشی مذہب کے ماننے والے ہیں لہذا وہ اس بات کا انکارکرنے پرمجبورہیں کہ ہم خدا کی حقیقت کو جان سکتے ہیں ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "ہم جو خدا کے سامنے رینگنے والی مخلوق کی مانند ہیں اوراس کی لامحدود وعظمت،محبت اوررحم کوکس طرح جان سکتے ہیں ؟یہ عقیدہ ملحدانہ ہے۔ اورہم اس کونہیں مان سکتے کیونکہ اگرچہ ہم محدود العقل ہونے کی وجہ سے خدائے لامحدود کوکامل طورپرنہیں جان سکتے ۔پراس سے یہ لازم نہیں آتاکہ ہم کو خدا کی معرفت حقیقی اورقطعی طورپرحاصل نہیں ہوسکتی۔ یاکہ ہم مختلف مذاہب کے تصورات میں سے بھلے بُرے کی تمیز نہیں کرسکتے یاکہ کسی قطعی مکاشفہ کا ہوناناممکنا میں سے ہے۔ہم اس بات کوایک مثال سے سمجھا دیتے ہیں۔ کسی سائنسدان کوذریت (Atom) کا علم کامل طورپرحاصل نہیں اورروئے زمین پرکوئی شخص یہ دعوٰی نہیں کرسکتاکہ ذرات کی نسبت جوعلم حاصل ہوسکتا ہے وہ سب اُسکو حاصل ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتاکہ کسی سائنسدان کا موجودہ علم درحقیقت راست اوردرست نہیں اورذریت کے مختلف نظریہ جات جو ابتدائے آفرینش سے تاحال مختلف ممالک واقوام اورازمنہ کے فضلاء نے وضع کئے ہیں وہ سب کے سب یکساں طورپر صحیح ہیں اوران میں اچھے بُرے کی تمیزکرنا وقتِ عزیزکوگنوانا ہے۔

۴

مسٹرگاندھی کہتے ہیں کہ لامحدود ہے لیکن اس سے لفظ سے وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ اس کے لامحدود نام ہیں اورہرشخص اپنی پسند کے موافق اس کا نام پکارکراس سے دعاکرسکتا ہے۔ لیکن جب ہم خدا کولامحدود کہتے ہیں تواس سے ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ زمان ومکان کے لحاظ سے لامحدود ہے یااس کے نام لامحدود ہیں بلکہ ہمارا مطلب یہ ہوتاہے کہ اس کی صفات مثلاً رحم، محبت وغیرہ کی کوئی حد نہیں۔ مسٹر گاندھی کہتےہیں کہ چونکہ تمام

مذاہب میں خدا کا تصور موجود ہے لہذا وہ سب یکساں طورپر صحیح ہیں۔ بفرض محال اگرہم تسلیم بھی کرلیں کہ ادیانِ عالم میں خدا کا تصورموجود ہے توہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا تصورِخدا کی مجرد موجودگی کل مذاہب کویکساں طورپر حق اوردرست قراردے سکتی ہے؟ کیا تمام مذاہب میں خدا کا تصوریکساں ہے کہ وہ سب برابر طورپر حق اورصحیح قراردیئے جائیں؟ جیسا ہم پیشتر ذکرکرچکے ہیں جس شخص نے ادیانِ عالم کا سطحی طورپربھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ خدا کے تصورات کی وجہ ہی سے مذاہب میں اختلاف ہے۔ اس کی بجائے کہ خدا کا تصورتمام مذاہب کویکساں کردے وہ اُن میں جدائی ڈالتا ہے ۔ خدا کے تصورات کے اختلاف کی وجہ سے مذاہب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اوریہ اختلاف سطحی اختلافات نہیں بلکہ بنیادی اوراُصولی اختلافات ہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب میں مطابقت اورکلی موافقت محال عقلی ہوجاتی ہے۔ مثلاً ہندودھرم کے بعض فرقے اوراسلام اورمسیحیت کے پیرو ایک خدا کومانتے ہیں۔ لیکن تینوں مذاہب میں جوتعلیم ذاتِ الہٰی کی نسبت پائی جاتی ہے وہ ایک دوسرے سے اس قدرمختلف ہے کہ ان کو برقرار دینا توایک طرف رہا اُن کویک جاکرنا اجتماع الضدین کویک جاکرنے کے مترادف ہے۔ پس محض خدا کو ماننے سے مذاہب میں باہمی موافقت کسی طرح ہوسکتی ہے؟ جس قسم کے ایشور کو ہندودھرم مانتا ہے اسلام کے نزدیک وہ عقیدہ کفر ہے۔ جس قسم کے اللہ کو اسلام مانتا ہے مسیحیت کے نزدیک وہ نہایت غیرمکمل ہے۔آریہ سماج کے تصورِخدا اورمسیحیت کے تصورِخدا اس میں ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جو کسی عقلی کرشمے سے عبورنہیں کی جاسکتی۔پس سوال یہ نہیں کہ ہرشخص خدا کو مانتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے خدا کو مانتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کی یہ قدرتاً تمنا ہوتی ہے کہ اس میں وہی اوصاف پیدا ہوں جواس کے معبود میں ہیں۔ چنانچہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ" تخلقوا بااخلاق اللہ یعنی تم اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کرو اوربھاگوت گیتا میں کرشن کہتا ہے کہ:

جس کوپوُجے اُس کو پائے پتر یاجنات
میری پوجا کرنے والا پائے میری ذات

(مترجمہ مفتی غلام رسول)

جس سے ظاہر ہے کہ ہرانسان کا اخلاقی نصب العین اور روحانی مطمح نظر اُسی قسم کا ہوگا جس قسم کا اس کا معبود ہوگا۔ پس اگراس کا تصورِخدا غلط ہوگا تواس سے اخلاق سوزرحرکات سرزد

ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ بائبل شریف میں اہل یہود کے انبیاء مثلاً حضرت یرمیاہ اورحضرت یسعیاہ اپنی اُمت اسرائیل کودیگر مذاہب کے معبودوں کی پرستش سے منع کیا کرتے تھے۔ مثلاً اہل یہود کے قرب وجوار کی بُت پرست اقوام سونے کی بیل کی پرستش کرتی تھیں جس سے بنی اسرائیل پر یہ اثر ہواکہ وہ سونے اورچاندی کوو بعت دینے لگ گئے تھے۔بیل طاقت کی نشانی تھی۔ لہذا بنی اسرائیل ہمیشہ اس آزمائش میں مبتلا رہتے تھے اورزندہ خدا کو چھوڑکر قوت اور طاقت کے مظاہرہ پر بھروسا رکھتے تھے۔ لہذا خدا نے اپنے نبیوں کی معرفت ان کو باربار متنبہ کیا اورفرمایا "نہ زورسے اورنہ طاقت سے بلکہ میری روح سے خداوند رب الافواج فرماتاہے"(ذکریا ۴: ۶) اسی طرح ہمارے ملک کے ہندوکالی دیوی کے آگے قربانیاں چڑھاتے ہیں اوراس کا اثر ہمارے وطنوں کے اخلاق پرپڑتا ہے ۔ لیکن سیدنا مسیح کی صلیب کے ارد اگرد ہم کو کالی گھاٹ کی سی فضا نہیں ملتی جس میں دم گھٹنے لگے۔ ابن اللہ کے پرستاروں کو حکم ہے کہ:

تم اپنے بدن ایسی قربانی ہونے کے لئے نذرکرو جوزندہ پاک اورخدا کو پسندیدہ ہو۔ یہی تمہاری معقول عبادت ہے"(رومیوں ۲: ۱)۔

پس سوال درحقیقت یہ ہے کہ کس قسم کا خدا بنی نوع انسان کا معبود ہوسکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم ہے کہ خدا انتقام لینے والا خدا ہے جوقہار اور جبار ہے اور وہ گنہگاروں کو نارِ جنہم میں ڈالتا ہے۔ انجیل جلیل کی تعلیم ہے کہ خدا محبت کرنے والا باپ ہے جو گنہگاروں کو بے حد پیارکرتا ہے اورمحبت کے ذریعہ اُن کو پنی طرف لوٹالاتا ہے۔ آریہ سماجی کہتا ہے کہ خدا ہرگز ہمارے گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔ اورکرم اورتناسخ کے چکر کی تعلیم دیتا ہے۔گاندھی جی نے خود کہا تھا کہ صوبہ بہار کے ۱۹۳۴ء کے زلزلے وہاں کے باشندوں کے گناہوں کی سزا تھے۔ اب سوال یہ پیداہوتا ہے کہ کیا خدا کے یہ تینوں تصور جوایک دوسرے کی ضدہیں ۔ یکساں طورپر درست اورصحیح ہوسکتے ہیں؟ ہرصاحبِ ہوش جانتا ہے کہ اجتماع الضدین محالات میں سے ہے۔ ان مختلف نظریوں میں سے اگرایک درست ہے تودوسرا لازمی طورپر غلط ہوگا۔ اوردونوں صحیح نہیں ہوسکتے۔ایک اورمثال لے لیجئے ۔ یہودیت ،مسیحیت اوراسلام متفقہ طورپر خدا کا ایک ایسا تصورپیش کرتے ہیں جوبُت پرستی کے خلاف ہے۔ مسٹر گاندھی ہندومذہب کے ہم نواہوکر کہتے ہیں کہ" میں بُتوں کے ماننے کے خلاف نہیں ہوں" اب یہ دونوں

یکساں طورپر صحیح اوردرست نہیں ہوسکتے۔ اگریہودی مسیحی اوراسلامی تصوردرست ہے توسناتن دھرم اورگاندھی جی کا تصورِخدا غلط ہے اوراگرآپ کا تصورصحیح ہے توپہلا تصورغلط ہوگا۔

چند ایک اورمثالیں ملاحظہ فرمائیے:

اسلام میں گائے کی قربانی جائز ہے، لیکن گئور رکھشا مسٹر گاندھی کے مذہبی عقیدہ میں داخل ہے۔ اب فرمائیے کہ دونوں یکساں طورپرکس طرح صحیح اوردرست ہونگے؟

گاندھی جی عدم تشدد کواپنے مذہب کا جزواعظم مانتے ہیں لیکن اگرایک پٹھان مسلمان بحکم آیہ قرآن وقاتلو ھمہ حتی کہ لاتکون فتنہ ویکون الدین کلمہ اللہ" (یعنی تم ان سے اُس حد تک لڑوکہ ان میں فساد عقیدہ (یعنی شریک) نہ رہے اور خالص ہی کا ہو جائے (ترجمہ اشرف علی تھانوی) کسی مشرک کوقتل کردے۔ تواب گاندھی جی ان دونوں متضاد باتوں کویکساں طورپر صحیح اوردرست کس طرح تسلیم کرسکتے ہیں ؟

گاندھی جی ذات پات کی تقسیم کو انسانی سرشت میں داخل سمجھتے ہیں۔ جس طرح یونان کا مشہورفلاسفر ارسطو غلامی جیسی قبیح چیزکو انسانی سرشت میں داخل سمجھتا تھا۔ گاندھی جی اس ذات پات کے تفرقہ کو اپنے مذہب کا جزو قراردیتے ہیں اورکہتے ہیں کہ میں ورن آشرم دھرم کا قائل ہوں" لیکن ایک مسیحی کل بنی نوع انسان کو خدا باپ کا خاندان تصورکرکے ذات پات کی تقسیم کو ننگِ انسانیت قراردیتا ہے۔ اب مسٹرگاندھی کس طرح دومتضاد کویکساں طورپر حق اوردرست تسلیم کرسکتے ہیں؟

ویدانت اورمسیحیت کے اصولوں کولیجئے ۔ دونوں مذاہب خدا اورخلقت کی نسبت جداگانہ عقائد رکھتے ہیں جوایک دوسرے کے ساتھ ہرگز مطابقت نہیں رکھتے۔ توکیاہم یہ مان سکتے ہیں کہ ان دونوں مذاہب میں درحقیقت کوئی فرق نہیں بلکہ فرق صرف سطحی ہے جب حقیقت یہ ہے کہ اُن میں بعد المشرقین کا فرق ہے؟

کیا پُرانوں کے کرشن اورانجیل کے مسیح میں بنیادی اوراصولی فرق نہیں ہیں؟ کیا دونوں کی اخلاقی اورروحانی حالت ایک ہی سطح پر ہے اوریکساں طورپر دونوں مساوی درجہ کے ہیں؟ جس شخص کو کرشن کے کارناموں سے اورسیدنامسیح کے خیالات جذبات اورافعال سے رتی بھربھی واقفیت ہے۔ وہ فوراً بول اٹھے گا کہ

به بیں تفاوت راہ ازکجا است تابہ کُجا

کوئی شخص بھی جس کے سر میں دماغ اوردماغ میں عقل ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ پُرانوں کے کرشن کے کارنامے تمام ممالک اوراقوام اورازمنہ کے لئے بہترین نصب العین ہیں۔ لیکن انجیل کا مسیح دوہزارسال سے مختلف ممالک اوراقوام اورازمنہ کے لاکھوں بلکہ کروڑوں اشخاص کے لئے ایک کامل اوراکمل نمونہ رہا ہے اوراب بھی مشرق مغرب کے ممالک کے لوگ آنخداوند کے سامنے ہی سرتسلیم خم کرتے ہیں اورتاقیامت کرتے رہیں گے۔ گاندھی جی بھاگوت گیتا کے کرشن کے مداح ہیں۔ لیکن کیا بھاگوت کا کرشن خدا کا اعلیٰ ترین مظہر اورروحانیت کا کامل نمونہ ہے؟ بھاگوت گیتا ایک فلسفیانہ کتاب ہے جس میں کرشن مہاراج کے کیریکٹر کودکھایا نہیں گیا تاہم جوکچھ اس میں ہم کو نظر آتا ہے وہ ایسا نہیں کہ دنیا کے لئے مطمح نظر ہو۔ مثلاً گیتا کے شروع ہی میں ارجن اس خیال سے کانپ اٹھتا ہے کہ وہ جنگ میں اپنے رشتہ داروں کو قتل کرنے والا ہے اور کہتا ہے:

"افسوس ہم سلطنت کی خاطر اپنے عزیزو اقارب کوقتل کرنے کے گناہ میں مبتلا ہیں"۔

ہمارے دلوں میں ارجن کے لئے عزت پیدا ہوجاتی ہے کہ یہ شخص قتل اورخون کرنے کی بجائے اپنی سلطنت قربان کرنے کوتیار ہے۔لیکن بھاگوت گیتا کے کرشن مہاراج کیا جواب دیتے ہیں؟آپ کہتے ہیں کہ تم بے شک قتل اورخون کرو۔ کیونکہ تم انسان کی روح کوقتل نہیں کرتے بلکہ اس کے جسم کوقتل کرتے ہو(۲: ۲۹)۔ کیا کوئی قاتل کسی عدالت میں یہ دلیل عذر کے طورپر پیش کرسکتا ہے؟ کیا ایسی دلیل کا پیش کرنے والا خدا کا اعلیٰ ترین مظہر قرار دیا جاسکتا ہے؟مہاتما جی اہمسا کے قائل ہیں۔ کیا وہ اپنے اہمسا کے اصول کو پیش نظر رکھ کر گیتا کے کرشن اورپہاڑی وعظ کے مسیح کویکساں طورپرخدا کے اوتار اورمساوی درجہ کے اعلیٰ ترین مظہر کہہ سکتے ہیں؟ ایک ہندو نے کیا خوب لکھا ہے کہ:

"مسیح کی صلیب نے انسانی نسل کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کردیا ہے۔ کوہِ کلوری کی صلیب نے اوتاروں کی آمد کی غرض اورمدعا کا کلیتہً تبدیل کردیا ہے۔یسوع سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھاکہ اوتا رلینے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جنگی طاقت اورجسمانی قوت سے بدی کو مغلوب کیا جائے۔ لوگ یہ خیال کرتے تھے اوراب بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ جب خدا انسانی جسم اختیارکرکے اس دنیا میں آتا ہے

تواس کے آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اشخاص کو قتل کرے جومجسم بدی ہیں تاکہ نیکی کی فتح ہو۔لیکن کیا کسی ایک شخص کے مرنے یا کسی جنگ کے واقع ہونے سے بدی مغلوب ہوجاتی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہوتا۔ مسیح کی صلیب نے بدی کو مغلوب کرنے کا ایک نیا طریقہ دنیا پر ظاہر کیا ہے۔صلیب کا مقصد محض بدی کومغلوب کرنا ہی نہیں بلکہ بدکردار شخص کو جس سے بدی ظہور میں آتی ہے نیک اورراستبازبنانا ہے۔ اگرہم بدکردارشخص کوجان سے مارڈالتے ہیں توبدی کوجڑ سے اکھاڑ نہیں دیتے۔ اس کے برعکس جسمانی طاقت کا مظاہرہ بدی کوپھیلاتا ہے۔ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ بدکردار شخص کونیک کرداربنایا جائے"(گارڈین ۲ مئی ۱۹۳۵ء)۔

اب مہاتما جی ہی ہم کو بتلائیں کہ خدا کے اوتار لینے کے یہ دومقصد جوگیتا اور انجیل میں مذکورہیں کس طرح یکساں طورپر صحیح اوردرست ہوسکتے ہیں؟ ان دونوں کویکساں طورپر صحیح ماننے والا اس شخص کی مانند ہے جوبیک وقت دومتضاد سمتوں میں جانے والی گاڑیوں میں سوارہونا چاہے۔

خود ہندومذہب میں شکتی مت کے اُصول اوروشنومت کے اصول میں عظیم فرق ہے۔وہ ایک دوسرے سے کوسوں دوُرہیں۔ پس دونوں یکساں طورپر صحیح اورراست نہیں ہوسکتے۔

اسی طرح بُدھ مت اورمسیحیت میں عظیم فرق ہے۔ ایک قابل بودھ محقق مسٹر ڈی۔ بی۔ ایلے پولا (D.B.Ellopoai) کہتا ہے[14]۔

میں اس تلاش میں تھا کہ مسیحیت اوربدُھ مت میں کوئی بات ایسی ملے جو دونوں میں بنیادی طورپر مشترک ہو۔لیکن مجھ کو نہ ملی ،مسیحیت کی تعلیم کی اساس دعا اورایمان ہیں۔لیکن بودھ مذہب کی نظرمیں ان دونوں کی کچھ و ۔عت نہیں"۔

ڈاکٹر البرٹ شوٹیزر(Schweitzer) کہتا ہے :

"یسوع مسیح کے خیالات میں اوربدھ یابرہمنوں کے خیالات میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ۔ دونو ایک دوسرے سے کلیتہً مختلف ہیں۔ برہمن اوربُدھ دنیا کو کہتے ہیں کہ دنیا میں تم اس طرح رہوکہ گویا مرگئے ہو۔ اوراس کے ساتھ تمہارا کسی قسم کا واسطہ نہیں رہا۔لیکن یسوع کی انجیل کہتی ہے کہ تم دنیا میں اپنے

[14] Quoted, by Dr/ Macnicol in Fellowship for August,1928

نفس پر قابو پاکر اس طرح محبت بھری زندگی بسر کروجس سے خدا کا جلال ظاہر ہو۔ ہندودھرم کے مطابق خدا ایک سمندر ہے۔ جس میں انسان تیرنے سے تنگ آکر ڈوبنا چاہتا ہے۔لیکن مسیحیت کا خدا ایک زندہ اخلاقی ہستی ہے جوہمارا باپ ہے اورہماری قوتِ ارادی کوتقویت عطا کر کے اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ان دونوں تصورات میں بنیادی فرق ہے۔ برہمن مت اوربُدھ مت میں اخلاق صرف الفاظ تک ہی محدود ہے لیکن اس کا اثر افعال پر نہیں پڑتا۔ ایسے مذاہب کسی طرح بھی محبت کے مذاہب نہیں ہوسکتے۔کیونکہ ان مذاہب میں روحانیت کا تعلق محبت کے جذبہ کے ساتھ نہیں۔اب یہ ظاہر ہے کہ روحانیت کا تعلق اخلاقیات کے ساتھ ہے اورروحانی نصب العین اخلاقی زندگی میں ظہور پکڑتا ہے۔ ہندودھرم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ترس اورہمدردی کا مذہب ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے دلوں میں تمام مخلوقات کے لئے ترس ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی اپنا نصب العین یہ قرار دیتا ہے کہ ہم کو طرح کے جذبہ سے خالی اورہرطرح کے فعل سے پرہیز کرنی چاہیے حتیٰ کہ نیکی اوررحم دلی کے جذبات پربھی ہم کو غالب آنا چاہئیے۔ پس اس مذہب میں رحم ترس،ہمدردی وغیرہ کے جذبات محض زبانی جمع خرچ ہیں جن کا رتی بھر اثر روزمرہ زندگی پر نہیں پڑتا"۔

بُدھ کے زمانے میں مجرموں کے اعضا کاٹ کر اُن کوزندہ رکھا جاتا تھا۔ تاکہ وہ درد کے مارے کراہتے کراہتے مریں۔ لیکن گومہاتما بُدھ نے حیوانات پرظلم کرنے کے خلاف تعلیم دی۔ لیکن آپ نے مجرم انسانوں کے ساتھ اس قسم کی بیرحمی کے خلاف کبھی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔

۷

گاندھی جی اوران کے ہم خیال اصحاب کے نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ کوئی مذہب عالمگیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن کیا ہماری عقل اس بات کو مان سکتی ہے کہ اگرکوئی بات حق اوردرست ہے تووہ صرف ایک خاص قوم اورطبقہ کے لئے ہی حق اوردرست ہے۔ اوردوسری قوموں اور طبقوں کے لئے باطل اورناقابل قبول ہے؟ اگرخدا کا کوئی تصوردرحقیقت برحق ہے توکیا وہ صرف کسی خاص قوم اورطبقہ کے لئے ہی برحق ہے؟ کیا وہ کل اقوام اورممالک اوربنی نوع انسان کے لئے سچا اوربرحق نہ ہوگا؟کیا خدا کا اعلیٰ ترین تصور ایک ملک اورقوم کے حق میں اکسیر ثابت ہوکر اس قوم اورملک کے

افراد کی اہم اوربنیادی انسانی ضروریات کوپورا کرسکتا ہے۔ لیکن دوسری قوم اوردوسرے ملک کے افراد کے حق میں زہر قابل ثابت ہوکر ان کی اصلی اوربنیادی انسانی تقاضاؤں کو برباد کرسکتا ہے؟کیا انسانی سرشت ایک واحد اورناقابل تقسیم شے نہیں ہے؟ اورکل نوع انسانی ایک ہی خون سے پیدا نہیں ہوئی؟ اگرتمام ممالک اوراقوام کے انسانوں کی سرشت درحقیقت ایک ہی ہے توکیا خدا کا اعلیٰ ترین تصور سب اقوام عالم کے لئے اعلیٰ ترین نہیں ہوگا؟ پس لازم ہے کہ کوئی نہ کوئی مذہب عالمگیر مذہب ہوجواقوامِ عالم کا ہادی اورر ہنما ہو اورجس کے اُصول ہرزمانہ اورملک اورقوم کے افراد کے لئے نصب العین کا کام سرانجام دیں۔ اورجب تک انسان صفحہ ہستی پر موجود ہے تب تک وہ مذہب اس کی سرشت کے اصلی تقاضاؤں اوربنیادی ضرورتوں کو پورا کرے۔

ہم ایک مثال سےاس بات کو واضح کردیتے ہیں ۔ علمی دنیا میں مختلف امور کی نسبت ہزاروں نظریہ جات انسانی عقل نے ایجاد کئے ہیں ۔لیکن کوئی صاحبِ عقل ان تمام نظریوں کویکساں طورپر درست اورصحیح نہیں مانے گا، مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ سورج زمین کے گردگھومتا ہے ، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں۔ زمین سورج کے گردگھومتی ہے۔ اب کوئی صاحبِ ہوش یہ نہیں کہیگا کہ یہ دونوں نظرئیے یکساں طورپر صحیح اورردرست ہیں۔ یہ محض خیالات کا اختلاف ہے۔ زمین اورسورج کی ہستی کے تو دونو قائل ہیں ۔ ایک قوم اورملک پہلا نظریہ مان لے اوروہ نظریہ اُس کو مبارک ہو۔ دوسرا ملک دوسرا نظریہ مان لے اوروہ اُس کومبارک ہو۔ محض نظریوں پر بحث کرکے مفت سردردی کیوں مول لیتے ہو۔

سائنس کے حقائق کا انکشاف اس طرح نہیں ہواکہ بنی نوع انسان کے ہر قسم کے توہمات کویکساں اوربرابر طورپرتسلیم کرکے صحیح تصورکرلیا گیا ہو بلکہ صحیح تصورات کوباطل خیالات سے جدا کرکے سائنس دانوں نے دونوں میں حدِ فاصل قائم کردی اُنہوں نے اپنے خیالات کی خاطر ہرقسم کا ایثار قبول کیا۔ان کو اذیتیں دی گئیں۔اُنہوں نے حق کی خاطر عقوبتیں سہیں۔ لیکن وہ حق اورباطل کے امتیازپر قائم رہے۔ اگرمسٹرگاندھی کے اُصول رواداری پر عمل کیا گیا ہوتا توسائنس کے حقائق کا علم تودرکنار سائنس کی بنیاد بھی نہ پڑسکتی اوردماغی ترقی کا کبھی کا خاتمہ ہوگیا ہوتا، کیا عقل سلیم اس بات کو مان سکتی ہے کہ اگرکوئی علمی نظریہ یا سائنس کا اصول سچ

ہوتا ہے تووہ صرف ایک خاص قوم یافرد کے لئے ہی سچ ہوتا ہے اوراقوام عالم کے لئے سچ نہیں ہوتا؟

حق تو یہ ہے کہ صداقت اورراستی ایک عالمگیر شے ہے خواہ وہ عقل کے ساتھ تعلق رکھتی ہو یا روح کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ اسی طرح عالمِ اخلاق میں اگرکوئی شے بُری ہے تووہ کسی خاص فرد یا ملک یا قوم کے لئے بُری نہیں بلکہ اقوام عالم کے ہرفرد بشر کے لئے بُری ہے۔پس جوشے حق ہے وہ کل عالم کیلئے حق ہے۔ حق کے اُصول پر سودیشی کے اُصول کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔

لہذا اگر خدا ہے اوراس خدا کا حقیقی عرفان اورمکاشفہ حاصل ہوسکتا ہے کہ تووہ حقیقی عرفان اورمکاشفہ تمام دنیا کے کل ممالک اوراقوام کے ہردبشر کے لئے حق ہوگا۔اگریہ حق ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے اوروہ ہم سے پیارکرتا ہے تووہ کل بنی نوع انسان کا باپ ہوگا۔ اوراس کی محبت کل افراد پر حاوی ہوگی۔ اورایک ہی الہٰی تصورتمام بنی نوع انسان کے لئے حق اوردرست ہوگا۔ دیگر تمام تصورات یاغیر مکمل ہونگے اوریاغلط اورباطل ہونگے۔ اگر خدا نے اپنے آپ کو انسان پر کامل اوراکمل طورپر ظاہر کیا ہے توایسا مکاشفہ اورظہورکل بنی نوع انسان کے لئے یکساں طورپر صحیح اوردرست ہوگا اورکسی خاص قوم یا ملک یا زمانہ کے ساتھ اس کا مختص ہونا امرِ محال ہوگا۔

مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا کا جومکاشفہ مسیح اوراس کی انجیل میں ہے وہ آخری اورقطعی ہے۔ ہم مسیحی مذہب کو ان معنوں میں قطعی مانتے ہیں کہ کلمتہ اللہ کے اُصول قطعی طورپر ابدتک صحیح اور راست ہیں اوران اصولوں کے اندربنی نوع انسان لامحدود وروحانی ترقی کرسکتے ہیں ۔ ہم اپنے مطلب کو ایک موٹی مثال سے واضح کردیتے ہیں ۔ علم ریاضی کا یہ اصول ہے کہ دواوردوچار ہوتے ہیں اوریہ اصول قطعی ہے اورابدتک صحیح ہے۔ لیکن علم ریاضی اس اصول پر ختم نہیں ہوجاتا۔وہ اس اصول اوردیگراصول کی حدود کے اندرلامحدود ترقی کرسکتا ہے ۔ اسی طرح مسیحیت کے بنیادی اصول قطعی طورپرحق ہیں ۔کیونکہ ان کاتعلق الہٰی ابوت ومحبت اورانسانی اُخوت ومساوات ومحبت کے ساتھ ہے اور ہرقوم ملک زمانہ اورنسل کے افراد اس زینہ کے ذریعہ لامحدود روحانی ترقی کرسکتے ہیں۔

مسیحیت عالمگیر مذہب ہے

ہم مندرجہ بالا سطور میں ثابت کر آئے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح درست اور راست نہیں ہوسکتے۔ یہ ایک لازمی امر ہے کہ جو مذہب حق ہو وہ عالمگیر بھی ہو اور اس عالمگیر مذہب کے ہر پیرو کا فرض ہے کہ اس کے پیغام اور اصول کی تبلیغ کرے۔

۱

عالمگیر مذہب سے ہماری مراد یہ ہے کہ:

اول : اس مذہب کے اُصول عالمگیر ہوں اور ہر ملک اور زمانہ کے افراد کی رہنمائی کرنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ کسی خاص ملک یا قوم یا زمانہ کے ساتھ وابستہ اور مختص نہ ہوں۔ وہ زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہوں اور اس بات کے اہل ہوں کہ ہر زمانہ اور کہ کوئی مذہب ملک کے حالات پر ان اصول کا اطلاق ہوسکے۔ یہ اصول تمام انسانوں پر حاوی ہوسکیں اور دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کے افراد ان اصولوں کی تعمیل کرسکیں اور ہر طرح کے دماغ اور سمجھ والے انسان اصول کے ذریعہ قربت الہٰی حاصل کرسکیں۔

اس مفہوم کا یہ مطلب نہیں کہ اس مذہب کے اصول کی کوئی خاص تفسیر یا تاویل عالمگیر ہونی چاہیے۔ چونکہ انسانی علم روز افزوں ہے لہذا اگر کسی عالم نے زمانہ ماضی میں اس مذہب کے کسی اصول کی تاویل اپنے زمانہ کے علم کی روشنی میں کی ہے۔ تو وہ زمانہ حال یا زمانہ مستقبل کے علم کی روشنی میں ناقص اور ناکافی ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن اُس مذہب کے اصول ایسے ہونے چاہئیں کہ ہر زمانہ اور ہر ملک اپنے وقت کے علم کی روشنی میں ان کی خاطر خواہ تاویل کرسکے۔ تاکہ ان کا اطلاق ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر قوم کے حالات پر ہوسکے۔ ان اصولوں کی کسی خاص تاویل یا تفسیر کے نقائص اور عیوب سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اصول خود معیوب ہیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ ان اصولوں کی پیش نظر تاویل غلط ہے۔ ہاں اگر وہ اصول اس تاویل کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوں کہ تاول کو ترک کرنے سے اصول کو ترک کرنا لازم آتا ہو تو وہ اصول ہرگز عالمگیر ہونے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھ سکتے ۔کیونکہ اس حالت میں وہ اصول زمان ومکان کی قیود سے آزاد نہ ہونگے۔ کسی مذہب کے عالمگیر اُصول وہی ہوسکتے ہیں جو انسانی سرشت کی فطرتی ضروریات کو احسن طور پر پورا کرسکتے ہیں۔ ایسے اصول میں

کسی قوم یاملک یازمانہ کی خصوصی ضروریات کی قید اور پابندی نہیں ہوسکتی ۔کیونکہ یہ خصوصی ضروریات عارضی سطحی اوروقتی ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی سرشت کی فطرتی ضروریات بنیادی اورعالمگیرہیں۔

دوم:عالمگیر مذہب کے لئے لازم ہے کہ اس کے بانی کی شخصیت ایک کامل اوراکمل نمونہ ہو۔ اوریہ نمونہ محض اس کے ملک یاقوم یا ہم عصروں کے لئے ہی نہ ہو۔ بلکہ ہر ملک اورقوم اورہرزمانہ کے افراد کے لئے ہو۔بالفاظ دیگر جس طرح عالمگیر مذہب کے اُصول عالمگیرہونے چاہیں ۔ عالمگیرمذہب کے بانی کے کیریکٹر میں یہ اہلیت اورصلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ ہر ملک اورقوم اورزمانہ کے کروڑوں افراد کا مطمح نظر اورنصب العین ہوسکے جو اُن کی روحانی ترقی کے مدارج اورمنازل میں ان کی رہنمائی کا کام بطرزِاحسن سرانجام دے سکے۔ پس لازم ہے کہ عالمگیرمذہب کے بانی کی زندگی کا نمونہ ایسا کامل اوراکمل ہوکہ وہ کل دنیا کا نورہوتاکہ جوکوئی اس کی پیروی کرے وہ اندھیرے میں نہ چلے۔ بلکہ اس کی روشنی کودیکھ کر روحانی لغزشوں سے بچا رہے۔ اس بانی کی روحانی زندگی نہ صرف ہرپہلو سے بدنما اورمعیوب دھبوں سے پاک اورمبرا ہو(کیونکہ یہ ایک منفی خوبی ہے) بلکہ لازم ہے کہ اس کا کامل نمونہ ہرطرح کی نیکی اورخوبی کی محرک ہو۔ اس کانمونہ ایک چشمہ ہوجو نہ صرف لوگوں کی روحانی زندگیوں کوسیراب کرنے والا ہو۔ بلکہ سیراب ہونے والوں کے اندر زندگی کے پانی کی ندیاں جاری کردے۔وہ نہ صرف روحانیت کے عالم کا ایک تاجدار ہوبلکہ وہ واحد تاجدار ہو۔وہ انبیاء اوراولیاء اورمصلحین کی قطارمیں کھڑا نہ ہو جن کی زندگیاں ناکامل اورجن کے نمونے غیر مکمل ہوتے ہیں بلکہ اسکی روحانیت کا نمونہ ہر جہت اورپہلو سے بے نظیر لاثانی اور بے عدیل ہو۔

کہ عدیم است عدینش چوخداوند کریم

سوم: عالمگیر مذہب کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف اس کے اصول عالمگیرہوں اوراس کے بانی کا نمونہ بے نظیرہوبلکہ وہ اپنے پیروؤں کو یہ توفیق اورفضل بھی عطا کرسکے کہ وہ اپنے بانی کے لاثانی نمونہ کو دیکھ کر اس کے اصول پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہوسکیں۔ اگرکوئی عالمگیرمذہب اپنے پیروؤں کوصرف نیک اعمال کرنے کی ہدایت کرتاہے اوران کو یہ توفیق نہیں دے سکتا کہ وہ اس عالمگیر اصولوں پر گامزن ہوسکیں تووہ مذہب عالمگیر نہیں

ہوسکتا۔ایسی مذہبی کتاب کی حیثیت علم الاخلاق کی کتاب سے زیادہ نہیں ہے۔ چہ جائے کہ وہ عالمگیر کتاب کہلانے کی مستحق ہوسکے۔علم اخلاق بھی یہی تلقین کرتا ہے کہ نیک عمل کرو۔لیکن نیک عمل کرنے کی توفیق عطا نہیں کرتا وہ ایسے محرکات اورمرغبات بہم نہیں پہنچاتا ہے جس سے نصیحت حاصل کرنے والا نیک اصولوں پر عمل کرسکے۔علم اخلاق اورشریعت کے ذریعہ انسان کویہ تومعلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں بات گناہ ہے۔ علم اخلاق کے ذریعہ اس کا گناہ ہونا ظاہر ہوگیا۔ اورشرعی احکام کے ذریعہ گناہ حد سے زیادہ مکروہ معلوم ہوگیا۔ لیکن گنہگارانسان اپنی پلید اورغلیظ عادتوں کے سبب گناہ کے ہاتھ بکا ہوا ہوتا ہے اورجب وہ کسی نیک کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تووہ گناہ کی غلامی کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے۔اورنہیں کرسکتا، بلکہ جس گناہ سے اس کو نفرت ہوتی ہے۔ وہی وہ کرلیتا ہے۔ کیونکہ گناہ اس میں بسا ہوا ہوتا ہے۔ البتہ نیک ارادہ تو اس میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن نیک کام اس ے بن نہیں پڑتے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزند
پرطبیعت ادھر ہیں آتی

یہی وجہ ہے کہ گنہگار جس نیکی کا ارادہ کرتا ہے، وہ نہیں کرتا لیکن گناہ کی غلامی کے سبب بدی کو کرلیتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ بدی ہے۔ جب وہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے توبدی اس کے پاس آموجود ہوتی ہے جو عقل کو اندھا کرکے اس کو گناہ کی قید میں لے آتی ہے۔ ایساانسان درستِ تاسف مل کر پکا راٹھتا ہے کہ ہائے میں کیسا کمبخت آدمی ہوں۔ مجھے اس گناہ کی غلامی اورقید سے کون چھڑائیگا؟ گناہ کی بیماری کا علاج یہ نہیں کہ گنہگارکونیک اعمال کرنے کی تعلیم دی جائے نیک اُصول کا علم اس کو پہلے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کو ایک نجات دینے والے کی ضرورت ہے جو اس کو گناہ کی غلامی کی اورقید سے رہائی دے اوراس کو یہ توفیق اورفضل عطا کرے کہ وہ اپنے گناہوں سے مجبور ہونے کی بجائے ان پر غالب آسکے اورعالمگیر مذہب کے روحانی اصول پر گامزن ہوسکے۔

ہم اس نکتہ کو ایک مثال سے واضح کردیتے ہیں ۔ایک شخص موٹر کے نیچے آجاتا ہے، اوراس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے ۔ ایک اور موٹرپیچھے چلی آتی ہے۔ اب ایک راہ گیراس بچارے کوآنے والی موٹر کے نیچے کچلے جانے کے خطرہ سے آگاہ کررہا ہے۔ اس دوری موٹر کو وہ شخص جوکچلا گیا ہے آتے دیکھ رہا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی ٹانگ

ٹوٹ گئی ہے اُس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ راستہ سے پرے ہٹ جائے ۔ اس کوکسی نذیر کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس کو اٹھاکر راستہ کی دوسری طرف کردے۔اسی طرح گنہگار کو جس کی زندگی گناہ کے ہاتھوں مردہ ہوگئی ہے۔ عالمگیر مذہب کے اصولوں کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُن سے تووہ پہلے ہی آگاہ ہے۔ اُس کو ضرورت اس بات کی ہے کہ اُس کی روح جومرگئی ہے زندہ ہوجائے۔اس کو نہ صرف عالمگیر مذہب کے اصولوں کے علم اورایک کامل نمونہ کے نورکی ضرورت ہے بلکہ اس کو زندگی کی ضرورت ہے تاکہ وہ زندگی کانور پائے۔اس کو فضل کی ضرورت ہے تاکہ توفیق پاکر وہ ازسر نو پیدا ہوکر خدا کے ساتھ رفاقت حاصل کرسکے۔

تہی دستانِ قسمت راہ سوداز رہبر کامل
کہ خضر ازآب حیواں تشنہ می آروسکندرا

چہارم ۔ یہ بھی لازم ہے کہ تاریخ دنیا عالمگیر مذہب کے دعوؤں کی تصدیق کرے۔ اگرعالمگیر مذہب کے اصول فی الحقیقت عالمگیر ہیں توضرور ہے کہ جس ملک اورقوم نے اس کو قبول کیا ہے اُس ملک اورقوم اورزمانہ کے حالات اس کے عالمگیر اصولوں سے متاثر ہوئے ہوں۔اُن اصولوں نے اُس ملک اورقوم کوشاہراہ ترقی پر چلایا ہو۔ اُس ملک اورقوم اورزمانہ کے باشندوں کی زندگیاں عالمگیر مذہب کے بانی کے کامل نمونہ سے متاثر ہوئی ہوں۔ اوران باشندوں کو اس مذہب نے یہ توفیق دی ہو کہ گناہوں سے چھٹکارا حاصل کرکے اپنے گناہوں پر غالب آئیں۔ قصہ کوتاہِ جس جس ملک میں عالمگیر مذہب پھیلا ہواُس ملک اورقوم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہو کہ فی الحقیقت اس مذہب کے اصولوں میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت اوراہلیت موجود ہے۔ عالمگیر مذہب کے دعوے محض زبانی جمع خرچ یا صرف اس کی مذہبی کتاب میں ہی موجود نہ ہوں بلکہ تاریخ بھی اس کے دعوؤں کی مصدق ہو۔ اگرتاریخ اس کے دعوؤں کی تکذیب کرتی ہے تووہ مذہب ہرگز عالمگیر نہیں ہوسکتا۔

۲

ہم نے اپنی کتاب مسیحیت کی عالمگیر" میں اس مضمون پر مفصل بحث کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ عالمگیر مذہب کی مندرجہ بالا تمام خصوصیات اکمل اوراحسن طورپر سیدنا مسیح اورآپ کی تعلیم میں موجود ہیں۔ کلمتہ اللہ بنی نوع انسان کے لئے ایک کامل اورزندہ نمونہ ہے۔ آپ کامل انسان ہیں۔ اورخدا کا کامل مظہر ہیں۔

آپ جہان کے منجئی ہیں اورروئے زمین کے کل گنہگار انسانوں کودعوت دیتے ہیں اوراس قابل بنادیتے ہیں کہ وہ شیطان کی غلامی کے جوئے کو اُتار پھینکے۔ آپ کی تعلیم کے اصول جامع اورمانع ہیں اورادیانِ عالم کا کوئی اچھا اصول ایسا نہیں جو بہترین صورت میں اس میں موجود نہ ہو۔ آپ کی تعلیم کی اساس محبت اُخوت اورمساوات ہیں۔ آپ نے دنیا جہان کو زن مرد اوربچہ کے احترام کا درس دیا۔ ذات پات درجہ بندی اوردیگر امتیازات کا خاتمہ کردیا اورجس قوم اورملک نے آپ کو اورآپ کی تعلیم کو صدق دل سے قبول کیا وہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوگئے۔

۳

پس جب مسیحیوں کا یہ پختہ ایمان ہے کہ ان کا مذہب حق پر ہے اوروہ عالمگیر ہے۔ اوروہ دیگر اقوام وممالک کی روحانی ضروریات کوبھی اُسی طرح پورا کرسکتا ہے جس طرح اُن کی اپنی روحانی ضروریات پوری کی گئی ہیں۔ تو ہر مسیحی یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اپنے مذہب کے اصول کی تبلیغ کرے اوردوسروں کو منجی کونین کی نجات کی خوشخبری دے تاکہ وہ دوسرے لوگ بھی سیدنا مسیح سے فیض یاب ہوسکیں۔ مسٹر گاندھی کا یہ کہنا کہ" اگرمشنری اہل ہند کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کرنا چاہتے ہیں تومیں ان سے یقینی طورپر کہونگا کہ آپ ہمارے ملک سے رخصت ہوجائیں "سراسر حق شناسی کے خلاف ہے۔ یہ ہرشخص کا پیدائشی حق ہے جوخدا کی طرف سے انسانی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے اورہرشخص پرفرض ہےبھی کیا گیا ہے ۔ کہ اگراس کو کوئی ایسی شے حاصل ہوجائے جوحق ہے تودوسروں کواس کی تلقین اورتعلیم دے۔

ہم اس کوایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ اگرکسی سائنسدان نے کوئی نئے شے دریافت کی ہے جو اس کے خیال میں صحیح ہے۔ یااگرکسی فلاسفر نے کوئی نیا نظریہ قائم کیا ہے جواس کے خیال میں درست اورراست ہے توکیا اس پر یہ واجب نہیں کہ وہ اہلِ علم پر اور اہل الرائے پر اپنی اس نئی دریافت یا نئے نظرئیے کوظاہر کرے؟کیا مسٹر گاندھی اس کو یہ کہیں گے کہ تم خاموش رہو اورحق بات کی تبلیغ مت کرو۔ کیا گاندھی جی گلیلیو، ڈارون وغیرہ کو یہ صلاح دیتے کہ گوتم حق پر اپنے آپ کو خیال کرتے ہو۔ تاہم خاموش رہو۔ تم کویہ حق حاصل نہیں کہ تم کہو کہ زمین آفتاب کے گردگھومتی ہے یا ارتقا کے اصول کی تلقین اورتبلیغ کرو۔ کیا اس طرزعمل سے دنیا میں علم

ترقی کرتا اورآج ہمارے عزیز ملک ہندوستان کوعلم کی روشنی کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوتا؟

۴

اگرمسٹرگاندھی کے اصول پر عمل کیا جاتا تومذاہب کے بانی اورمصلحین اورفلسفہ کے نئے اصول کبھی معرضِ وجود میں نہ آتے۔ ہمارے ملک یعنی قدیم ہندوستان کے مختلف فلسفیانہ خیالات اور اپنشد اس واسطے ظہور پذیر ہوئے کیونکہ ان کے بانیوں نے برہمنوں کی پروا نہ کی اور رسوم کی پابندیوں کی بجائے حقیقت کی تلاش کرنے کی جرات کی۔ اگرمہاتما بدھ یہ خیال کرتے کہ ہندوؤں کے لئے اُس زمانہ کا ہندومت کافی ہے تووہ نروان کے آٹھ نکات کی راہ نہ بتلاتے۔ اگرراجہ اشوک مسٹرگاندھی کی تعلیم پر عمل پیراہوتا تووہ بدھ مت کے مبلغین کولنکا، مصر اور ایشیائے کوچک نہ بھیجتا اوربُدھ مبلغین مشرقی ممالک اورچین وجاپان کے درو دراز سفروں کی زحمت نہ اٹھاتے اوریہ ممالک ہندوستان کے خیالات اورکلچر سے بہر ورنہ ہوتے۔ شنکر اوررامانج جوجنوبی ہند میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے خیالات تمام ہندوستان کومتاثر نہ کرتے۔ کیا کبھی کسی سلیم العقل شخص کے وہم وگمان میں بھی آیا تھاکہ راجہ رام موہن رائے ،کیشب چندرسین ،سوامی دیانند سرسوتی، رام کرشن پرہم ہمس یاویویکانند وغیرہ کی زبان بندی کرے اوران کوحکم دے کہ اپنے خیالات وغیرہ کا اظہارمت کرو؟

اگرگاندھی جی اپنے قائم کردہ اصول رواداری کے فلسفیانہ نتیجہ پر خودچلیں تویہ ظاہر ہے کہ ان کوخود کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ عدم تشدد کے اصول کی اوردیگر باتوں کی جن کو وہ مانتے ہیں تبلیغ کریں اورلوگوں تک پہنچانے کے لئے لاکھوں روپیہ پراپیگنڈامیں برباد کریں۔ گاندھی جی کا خود ساختہ اصول دنیا کے اُن تمام نبیوں ، مصلحوں، سائنسدانوں اخلاقی رہنماؤں کوقابل مذمت قراردیتا ہے جنہوں نے خود خق کو دریافت کرنے پر قناعت نہ کرکے اپنی جانوں کوخطروں میں ڈالا۔ ہر طرح کی ایذا سہی بلکہ جان تک دینے سے دریغ نہ کیا لیکن اس حق کو دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ یہ اصول انسان کی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ۔

اگربنیم کہ نابینا وچاہ است
وگرخاموش بنشیم گنا ست

ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ جب ایک اندھا کسی سرجن کے پاس جاکر اپنی آنکھوں کاآپریشن کراکے بینا ہوجاتا ہے

تواوروہ کسی دوسرے اندھے کودیکھتا ہے توخاموش ہوکر بیٹھ نہیں رہتا بلکہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دوسرے اندھے کوبھی اُس سرجن کی خبردے تاکہ وہ بھی بینائی حاصل کرے۔ افسوس اُس اندھے پر جو بینائی حاصل کرکے خاموش رہے۔ اسی طرح جس شخص نے سیدنا مسیح کے قدموں کے پاس آکر اپنے گناہوں سے نجات حاصل کرلی ہے وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ پولوس رسول فرماتا ہے۔

"میرے لئے یہ ضروری بات ہے کہ انجیل سناؤں بلکہ مجھ پر افسوس ہے اگرخوشخبری نہ سناؤں"۔میں یونانیوں اورغیریونانیوں۔ داناؤں اورنادانوں کا قرضدارہوں اوران کو خوشخبری سنانے کوحتی المقدورتیارہوں۔ اس لئے کہ وہ ہرایک ایمان لانے والے کے واسطے نجات کے لئے خدا کی قدرت ہے"۔ میرے لئےدعا کروتاکہ بولنے کے وقت مجھے کلام کرنے کی توفیق ہو۔ تاکہ میں انجیل کودلیری سے ظاہر کرسکوں ۔ جس کے لئے میں زنجیروں سے جکڑا ہوا ایلچی ہوں اوراس کوایسی دلیری سے بیان کروں جیسا بیان کرنا مجھ فرض ہے"۔

مسیح کی انجیل ایک خوشخبری ہے۔ وہ ایک جلالی حقیقت کا اعلان کرتی ہے۔ "مسیح کی محبت ہم کو مجبورکرتی ہے " کہ ہم اس خوشخبری کا اعلان کریں۔ ہم جوسیدنا مسیح کی محبت سے واقف ہوگئے ہیں مجنونانہ واراس محبت کااظہارکئے بغیرنہیں رہ سکتے تاکہ دوسرے لوگ بھی" ہمارے ساتھ شریک ہوں" جو لوگ اس زندگی کے کلام " کو جان گئے ہیں۔ وہ دوسروں کواس کی خبردیتے ہیں اوراس کی گواہی دیتے ہیں تاکہ دوسرے بھی اس زندگی میں شریک ہوجائیں(۱یوحنا۱: ۳)۔

ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ منجئی کونین اس لئے آئے تاکہ اس دنیا کے ہر ملک اورقوم کے افراد کو زندگی بخشیں اور"کثرت کے ساتھ" بخشیں۔ ہمارا پکا ایمان ہے کہ سیدنا مسیح ہمارے ملک کے افراد کو جماعتوں کو اورہماری قوم اورہمارے وطن کوزندگی بخش سکتا ہے اورہمارے ابنائے وطن کی مردہ اورخشک ہڈیوں میں زندگی کا مسیحائی دم پھونک سکتا ہے۔ہمارا پختہ ایمان ہے کہ ہمارے ملک کے بے ہودہ رسوم ورواج،توہمات اورمعاشرتی تمدنی اورقومی امراض سے وہ ہم کو نجات دے سکتا ہے۔ہم اپنے تجربہ سے جانتے ہیں کہ منجئی عالمین کی صلیب سے ایک ایسی قوت نکلتی ہے جوہمارے ابنائے وطن کوزندگی اورشفا بخش سکتی ہے۔ انجیل جلیل کا نصب العین یہ ہے کہ کل دنیا کے افراد ابن اللہ کی مانند زندگی بسر کریں۔ ہم جومسیحی ہیں غیرمسیحیوں کے پاس نجات کا

پیغام لے جاتے ہیں تاکہ وہ سیدنا مسیح کی مانند بن جائیں۔ ہم اُن کو یہ پیغام سناتے ہیں کیونکہ وہ بھی ہماری مانند انسان ہیں۔ پس یہ پیغام ہماری مانند اُن کی ضروریات اور مشکلات کوبھی حل اورپورا کرسکتا ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ دنیا کے افراد ابن اللہ کے بغیرہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اورہم خدا کے حضور جواب دہ ہوں گے اگریہ افراد منجئی عالمین کا نجات بخش پیغام سنے بغیر اس دنیا سے کوچ کر جائیں گے ۔ پس اس پیغام کوپہنچان سے دنیا کی کوئی طاقت ہم کوروک نہیں سکتی۔

کون ہم کو سیدنا عیسیٰ مسیح کی محبت سے جدا کرے گا ؟ مصیبت یا تنگی یا ظلم یا کال یا ننگا پن یا خطرہ یا تلوار؟ چنانچہ لکھا ہے کہ

ہم آپ کی خاطر دن بھر جان سے مارے جاتے ہیں۔
ہم توذبح ہونے والی بھیڑوں کے برابر گنے گئے ۔

مگر ان سب حالتوں میں ان کے وسیلہ سے جس نے ہم سے محبت کی ہم کو فتح سے بھی بڑھ کر غلبہ حاصل ہوتا ہے ۔ کیونکہ مجھ کو یقین ہے کہ پروردگارکی محبت ہمارے آقا ومولا سیدنا عیسیٰ مسیح میں ہے اس سے ہم کو نہ موت جدا کرسکے گی نہ زندگی۔نہ فرشتے نہ حکومتیں ، نہ حال نہ استقبال کی چیزیں ، نہ قدرت نہ بلندی نہ پستی نہ کوئی اورمخلوق ۔(رومیوں ۸باب ۳۵آیت)۔

بچارا مسٹرگاندھی کس شماروقطارمیں ہے کہ مسیحی مبلغین کو اس محبت کے اعلان کرنے سے روک سکے۔مسیحیت کی ابتدا ہی میں حاکموں اورسرداروں نے سیدنا مسیح کے شاگردوں کو "بلا کر تاکید کی کہ یسوع کانام لے کر ہرگزبات نہ کرنا اورنہ تعلیم دینا۔ مگراُنہوں نے جواب دیاکہ تم ہی انصاف کروآیا خدا کے نزدیک یہ واجب ہے کہ ہم خدا کی بات سے تمہاری بات زیادہ سنیں۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ جوہم نے دیکھا اورسنا ہے وہ نہ کہیں"(اعمال ۴ باب ۵تا ۲)۔ دنیا کے عظیم الشان شہنشاہوں۔ روم کے قیصروں۔ دنیا کے مختلف ممالک کے گورنروں اوروالیوں نے قہر اور جبرظلم اوراستنبدار وجوار وتعدی کے ذریعہ لاکھوں کوششیں کیں کہ مسیحیت کا پرچار نہ ہو۔لیکن وہ ناکام رہے۔ ان کی سلطنتیں مٹ گئیں ان کا اپنا نام بھی حرفِ غلط کی طرح محو ہوگیا۔ لیکن سیدنا مسیح کی انجیل کی خوشخبری روزِاول سے آج تک ہرملک وزمانہ کے کروڑوں انسانوں کی روحانی ضروریات کوپورا کرتی رہی اورتاقیامت پورا کرتی رہیگی۔یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے
مٹتا نہیں ہے لیکن نام ونشان ہمارا

پس ہندوستان کی کلیسیا بغیر کسی خوف وہراس کے اپنے نجات دہندہ کے جانفزا پیغام کو ہرکہ ومہ کوسناتی رہی گی اور نڈرہوکر اُن تمام حالات واشخاص کو روحانی ہتھیاروں سے مسلح ہوکر دلیرانہ مقابلہ کریگی۔ جو اُس کو اس مقدس فرض کے سرانجام دینے سے بازرکھنے کی ناکام کوشش کرینگے۔

باب ششم

تبدیلی مذہب کی ضرورت

ہم باب سوم میں ذکرکرچکے ہیں کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر فی زمانہ ہندوستان میں تبدیلی مذہب کو مخالفانہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ فرقہ وارانہ سب کی وجہ سے ہمارے ملک کی سیاسیات نے فرقہ وارانہ صورت اختیار کرلی ہے۔ چونکہ اس کمیونل اوارڈیا فرقہ وارانہ تناسب کی وجہ سے صرف مذہب کے پیروؤں کی تعداد وشمار ہی کی بناء پر ہر ایک فرقہ اورملت اپنے دنیاوی اقتصادی اورسیاسی حقوق کا مطالبہ کرسکتا ہے اورچونکہ مذہب کی تبدیلی سے ایک فرقے کے شمار میں کمی اوردوسرے کے شمار میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک کو ضعف اوردوسرے کوتقویت پہنچتی ہے۔ لہذا ہندوستان کا ہر فرقہ یہی کوشش کرتا ہے کہ اس کے مذہب کے پیرو اپنے آبائی مذہب کو ترک کرکےکسی دوسرے مذہب کو اختیار نہ کریں۔لیکن دوسرے مذاہب کے پیرو اس کے آبائی مذہب میں جوق درجوق داخل ہوجائیں تاکہ اس کے فرقہ کی مردم شماری کی تعداد میں ترقی ہوتی جائے اوررائے دہندگان کی اکثریت کی وجہ سے وہ دیگر فرقوں سے زیادہ حقوق حاصل کرسکے یوں

اُس کے فرقہ اورملت کی اقتصادی ترقی ہو اور وہ دوسرے فرقوں
اورگروہوں پرسیاسی غلبہ اوراقتدارحاصل کرسکے۔

پس مندرجہ بالا وجوہ کوزیر نظر رکھ کرہندوستان کے
مسلمان اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ہندو اورمسیحی مذہب کے
افراد اسلامی کلمہ پڑھ کراسلام کے حلقہ بگوش ہوجائیں اورجولوگ
اسلام کے دائرہ کےاندرہیں وہ مرتد ہوکر غیر مسلم مذاہب میں
شامل نہ ہوں۔ اس غرض سےاُنہوں نے شریعت بل مجلس قانون
سازی سے پاس کروالیا ہے۔ تاکہ مسلمان عورتیں فسح نکاح کی خاطر
غیرمسلم مذاہب میں داخل نہ ہوجائیں۔علیٰ ہذا القیاس ہندواسی
کوشش میں ہیں کہ اچھوت ادھار، مندروں میں اچھوت کا داخلہ۔
اوراسی قسم کی دوسری اصلاحوں وغیرہ کے ذریعہ انیس کروڑ
اچھوتوں کوہندوفرقہ کے دائرہ میں رکھیں اورشدھی کے ذریعہ
غیرہنود کوہندومت کے اندر داخل کرلیں۔ہندومصلحین کی ایک
کثیر تعداد صرف اس غرض سے اصلاحی کام میں ہمہ تن مصروف
ہے تاکہ ان کے سیاسی اقتدار میں فرق نہ آنے پائے۔جب سرکار
برطانیہ نے فرقہ وارانہ تناسب کا اعلان کیا اورمسٹر گاندھی نے دیکھا
کہ اچھوت اقوام کو سرکار نے ہندوؤں سے الگ ایک فرقہ تسلیم کرکے
ان کو جداگانہ حقوق دئیے ہیں اوراس تقسیم کی وجہ سے کروڑوں
اچھوت ہندوفرقہ سے الگ شمار کئے جائیں گے جس سے ہندوفرقہ
کے دنیاوی اقتصادی اورسیاسی غلبہ اوراقتدارکو ضعف پہنچے گا توآپ
نے مرن برت رکھ لیا اوراعلان کردیاکہ اگرسرکاربرطانیہ نے اچھوت
اقوام کوہندوفرقہ سے جدا ایک مستقل جماعت تصورکرکے ہندو
حلقہ کوتقسیم کردیا تومیں مرجاؤنگا۔اس دھمکی کا نتیجہ پوپنا پیکٹ
ہوا جس سے ہندواقتدار میں فرق نہ آیا۔ بالفاظ مولانا محمد علی
مرحوم" خلقت خدا کی ملک انگریز کا ۔حکم ہندومہا سبھا بہادرکا" قائم
رہا۔ اوریوں ع۔ اس گھر کوآگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

۲

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہم وطنوں نے
مذہب کو اپنے اپنے فرقہ کی دنیاوی ترقی اقتصادی حشمت سیاسی
نے غلبہ اوراقتدارکا ذریعہ بنارکھا ہے۔ اُن کو انسانی روح کی بھوک
اورپیاس کی پروا نہیں ۔ پس روحانی اُمور کی طرف سے بے نیاز ہوکر
ہمارے ہندواورمسلم ہم وطن مذہب کودنیاوی اغراض کی
تحصیل کا آلہ کاربنارہے ہیں اوریوں مذہب کی حقیقی علت غائی
کوپس پشت پھینک رہے ہیں ۔ خدا اورمذہب کی حقیقی قدرو بعت

اورعزت ان کے سینوں سے جاتی رہی ہے۔ بالفاظ مقدس پولوس "اُن کا پیٹ اُن کا خدا ہے"۔ پس اُن میں فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا ہوگئی ہے۔اوریہ ذہنیت اس قدرترقی کرگئی ہے کہ نہ ان کو خدا کا خوف رہا ہے اورنہ عقبیٰ کا خیال ان کو ستاتا ہے۔ ہرفرقہ سرتوڑکوشش کرتا ہے کہ دوسرے فرقے کے حقوق کے بے دریغ پائماں کردے اور اپنی جماعت کا اقتدار بڑھائے۔ پونا پیکٹ کے ذریعہ اہلِ ہنود کا اقتدار بدستور قائم رہا اوراس بات پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ لیکن اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر ابیدکارکوخوب معلوم تھاکہ اس پیکٹ سے ہندوؤں کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں آئیگا اوروہ اچھوتوں کوبدستور سابق حقارت کی نظر سے دیکھ کر ان سے حیوانوں کا ساسلوک کریں گے۔ پس اُنہوں نے بارباریہ دھمکی دی کہ اگر ہندو ذہنیت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تواچھوت اقوام کے کروڑوں اشخاص ہندومت کوترک کرکے کسی غیر ہندومذہب کے حلقہ بگوش ہوجائینگے۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر امبید کا اورہندوؤں کے لیڈر ڈاکٹر مونجی کی خط وکتابت شائع ہوئی۔ جس سے معلوم ہواکہ یہ اصحاب نہیں چاہتے تھے کہ اچھوت اقوام اسلام کے حلقہ بگوش ہوں اورمبادا اہل اسلام کی طاقت میں اضافہ ہوجائے اورنہ وہ چاہتے تھے کہ یہ اقوام مسیحیت کے دائرہ میں داخل ہوں مبادا برطانوی سلطنت کو تقویت حاصل ہو۔ ان لیڈروں کو یہ خیال نہ آیاکہ مسیحیت کوبرطانوی سلطنت کی تقویت سے کیا واسطہ ہے؟ اچھوت اقوام کی کرڑوں روحوں کی نجات کا خیال ان لیڈروں کے وہم وگمان میں بھی نہ آیا۔ سچ تویہ ہے کہ ان کو اچھوت اقوام کی دنیاوی ترقی کا بھی خیال نہیں۔ہاں اگر پروا ہے توصرف اس بات کی ہے کہ ہندوفرقہ کی اقتصادی ترقی طاقت اورسیاسی قوت میں فرق نہ آنے۔ چنانچہ چند سال ہوئے ۔یوپی کی لیجسلیٹو کونسل میں کانگرس کی حکومت کے دوران میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے ہم عبرت حاصل کرسکتے۔ اس صوبہ کےوزیرِ تعلیم نے اس بات کو تسلیم کرلیا کہ جس طرح وہ ہندو اچھوت اقوام کے طلباء کو ان کی مالی وناداری کی وجہ سے سرکاری وظائف دیتے ہیں وہ ان طلباء کوبھی وظائف دیں گے جو اُن اچھوت اقوام سے مسیحی ہوگئے ہوئے ہیں کیونکہ وہ بھی مالی طورپر نادارہیں۔ لیکن ہندوؤں نے (جواچھوت اقوام کی ترقی کی حمایت کے دعویدارہیں)کونسل میں ایسا طوفان بدتمیزی برپا کردیا کہ وزیر تعلیم کومجبوراًیہ گرانٹ بند کرنا پڑا۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جونہیں جانتے کہ وفا کیا ہے

چونکہ ہمارے پولٹیکل لیڈر نہیں چاہتے کہ تبدیلی مذہب سے ان کے فرقوں کی تعداد تناسب میں ضعف پیدا ہوا اور کسی دوسرے فرقہ کو تقویت پہنچے لہذا وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں ایک دوسرے سے رواداری سے پیش آؤ۔ ان کو خدا اورمذہب کی پروا نہیں ہوتی۔ پس وہ محض پولٹیکل وجوہ کی بناء پر مذہبی رواداری کی تبلیغ کرتے ہیں۔وہ ایک خودساختہ قضیہ قائم کرکے کہتے ہیں کہ تمام مذاہب میں سچائی موجود ہے۔ لہذا تمام مذاہب برابر ہیں۔ پس کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ۔ لہذا ہم کو اپنا مذہب تبدیل کرنا چاہیے اورہم اس بات کی برداشت نہیں کرسکتے کہ کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرے ۔ پس رواداری کی تبلیغ کا نتیجہ عدم رواداری ہوجاتا ہے !! جن لوگوں کی زبانوں پر رواداری کا وردجاری رہتاہے وہی رواداری کے حامی اورمبلغین اس بات کی برداشت نہیں کرسکتے کہ لوگ اپنے آبائی مذہب کو ترک کریں۔ مثلاً گاندھی جی مسیحی مبلغین کو کہتے ہیں "اگر آپ ہندوستان کے لوگوں کومسیحیت کا حلقہ بگوش کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہمارے ملک سے رخصت ہوجائیں"۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

مسٹرگاندھی یہ توچاہتے ہیں کہ مسیحی مبلغین ہندوستانیوں کی جسمانی اوردنیاوی ضروریات کوپورا کرنے میں مدد کریں۔لیکن مہاتما جی یہ نہیں چاہتے کہ ان کی آتماؤں کی ضروریات کو پورا کیا جائے ۔ کیا مہاتما جی جسم کوروح پر مقدم خیال فرماتے ہیں ؟سیدنا مسیح کا حکم صاف ہے کہ "تم پہلے خدا کی بادشاہت اوراُس کی راستبازی کی تلاش کروتویہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائینگی (متی۶: ۲۳)۔

یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ مسیحی مبلغین غیرمسیحیوں کو صحت علم اوردانش کے خزانے دے دیں۔

لیکن ان کوخدا کی بہترین بخشش سیدنا مسیح (یوحنا ۳: ۱۶آیت، ۴باب ۱۸آیت وغیرہ) سے محروم رکھیں۔

میرے حق میں اب یہ ارشاد فرمایا ہے کہ

خوب یہاں منقوش خاطر جانفشانی آپکی

لیکن میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں

روکھی پھیکی ایسی سوکھی مہربانی آپ کی

مسٹرگاندھی مسیحی مبلغین کو کہتے ہیں کہ تم اپنی مساعی جمیلہ کو لوگوں کو تعلیم دینے اوران کا جسمانی علاج رنے اوران کی حالت سُدھارنے تک ہی محدود رکھو اوربس۔ لیکن مسیحی مبلغین اپنے سیدنا مسیح اورمنجی کے احکام کومسٹرگاندھی سے بہتر جانتے ہیں۔جب سیدنا مسیح نے اپنی حین حیات میں اپنے حواریوں کوخوشخبری کا پیغام سنانے کے لئے روانہ کیا تو آپ نے خدا کی بادشاہی کی منادی کرنا سب سے مقدم فرض ٹھہرایا اورحکم دے کر کہا کہ:

جاؤ اورچلتے چلتے یہ منادی کروکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرو، مردوں کو جلاؤ۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرو۔ بدروحوں کونکالو۔ تم نے مصف پایا مفت (متی ۱۰: ۷)۔

پس خدا کی بادشاہی کی منادی دیگر باتوں پر مقدم اوراُن سب سے افضل ہے اورحق تویہ ہے کہ محض سوشل پروگرام جوروحانی تعلیم سے خالی ہوبے کار ہے۔ اگرمسیحی مبلغین خدانخواستہ مسٹر گاندھی کی بات پر عمل کریں گے کہ تولوگوں کوروٹی کی بجائے پتھر اورمچھلی کی بجائے سانپ دیں گے۔ مسٹرگاندھی ہزار بارکہیں کہ ہندوؤں کے لئے ہندوؤں کا مذہب کافی ہے۔لیکن جن ہندوؤں کی خدا نے آنکھیں کھولی ہیں اوروہ مسیحی نجات سے فیض یاب ہوئے ہیں ان کی یہ گواہی ہے کہ یہ بات سراسر غلط ہے اوروہ قرارنہیں پکڑسکتے تاوقتیکہ وہ اپنے ہم وطنوں کو خداوند کی نجات سے شادنہ کرلیں۔

اک آگ سی ہے سینہ کے اندرلگی ہوئی

جب مسٹرگاندھی جنوبی افریقہ سے اپنے وطن مالوف میں نئے نئے وارد ہوئے تھے توآپ نے مدراس مشنری کانفرنس کے جلسہ میں مسیحیت کی اشاعت پرایک درس دیا تھا۔آپ نے کھلے اورواضح الفاظ میں فرمایا کہ آپ تبدیلی مذہب کے خلاف ہیں۔ کیونکہ آپ کے خیال میں مذہب کی تبدیلی نیک نیتی سے نہیں کی جاتی بلکہ دنیاوی فوائد کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔اگرمسٹر گاندھی کومسیحی طریقہ تبلیغ سے کچھ بھی واقفیت ہوتی تووہ اس بات کو جانتے کہ مسیحی مبلغین کسی شخص کومحض دنیاوی طمع اوراغراض کی خاطر مسیحیت کا حلقہ بگوش نہیں کرتے۔اوراگر کوئی شخص ان کے پاس اس غرض سے آتا ہے توکوئی ذمہ دارشخص دیدہ دانستہ اس کو بپتسمہ دے کرکلیسیا میں شامل نہیں کرتا۔

مئی ۱۹۳۷ء میں چودہ تعلیم یافتہ ہندوستانی مسیحیوں نے ایک بیان شائع کیا جس میں اُنھوں نے لکھا کہ:

" مرد اورعورتیں فرداً فرداً خاندانوں کے خاندان یاگروہوں کے گروہ جوق درجوق مسیحی کلیسیا میں شامل ہوتے ہیں۔ اوریہ خدا کی روح کی تحریک کی وجہ سے ہے۔ پس دنیا کی کوئی طاقت اس لہر کو بند نہیں کرسکتی۔ لہذا ہندوستان کی مسیحی کلیسیا کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن لوگوں کوجوحق کے متلاشی ہیں قبول کرے ۔ اُن کو مسیحی تعلیم دے اوراُن کی روحوں کی خبرگیری کرے۔ کلیسیا کا یہ حق ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے حلقہ میں شامل کرے۔ خواہ وہ کسی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ کلیسیا کا یہ بھی حق ہے کہ اس مادیت کے دور اورالحاد کے زمانہ میں تمام لوگوں میں روحانی بھوک کے احساس کو بیدارکرے"۔

اس بیان کوپڑھ کر مسٹر گاندھی سیخ پا ہوگئے اوراُنھوں نے ذیل کے الفاظ حوالہ قرطاس کئے:

"میں نے اس بیا ن کو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا ہے اورمیں اس کی تائید میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ مرد اورعورتیں مسیحی کلیسیا کی رفاقت کو تلاش نہیں کرتیں۔اس لحاظ سے غریب ہریجن دوسروں سے بہتر نہیں ہیں۔ کاش کہ ہریجن میں سچی روحانی بھوک ہوتی۔ اگران میں اس قسم کی کوئی بھوک ہے۔ تووہ مندروں میں جاکر پوری کرسکتے ہیں۔ اگرچہ ان کا وہاں جاکر پرستش کرنا ایک بے معنی بات ہوتی ہے۔ جب دیگر مذاہب کے مبلغین ان کے پاس جاتے ہیں تووہ ان کے پاس سودا فروشوں کی طرح جاتے ہیں۔ان مبلغین کے پاس کوئی خاص روحانی شے نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ان مبلغین میں اوراچھوتوں میں تمیز ہوسکے۔ ہاں۔ ان کے پاس دنیاوی مال ضرورہوتا ہے۔ جس کا لالچ دے دے کر وہ ان کو اپنے مذہب میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے بعد مسیحی کلیسیا کا" فرض" ایک حق" کی صورت اختیارکرلیتا ہے۔ لیکن جب کوئی " فریضہ" ،حق" کی صورت اختیارکرلیتا ہے تووہ فریضہ نہیں رہتا۔کیونکہ فریضہ کوپورا کرنے کے لئے ایثار اورقربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن"حق" کوحاصل کرنے کے لئے طاقت کے مظاہرے کی ضرورت ہوتی ہے۔جس کے ذریعہ ہم اپنی مرضی کو دوسروں سے جبریہ منواسکتے اور قانونی چارہ جوئی کرسکتے ہیں۔ اگرمبلغین اپنے روحانی پیغام کوپہنچانے کا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں توان کو دعا اورروزرکھنا چاہیے۔ لیکن اگروہ " حق " جتلانا چاہتے ہیں ۔ تووہ غیر رضامند لوگوں پر جبر

کرتے ہیں۔ ان مسیحیوں کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کے جذبات کو ٹھنڈا کرے اوران کے احساسات کو قدر کی نگاہ سے دیکھے لیکن اس قسم کا بیان اس مقصد کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس کے برعکس ایسے بیان کو پڑھ کر بدمزگی پیدا ہوتی ہے"۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں توہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں توچرچا نہیں ہوتا

۵

ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر گاندھی مسیحی تحریك سے کلیتہً بے خبر ہیں۔ اگروہ مسیحی طرز تبلیغ سے واقف ہونے کی ذرا بھی زحمت گوارا کرتے تووہ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ نہ کہتے کہ" مبلغین اچھوت اقوام کے پاس سودافروشوں کی طرح جاتے ہیں۔۔۔ ان کے پاس دنیاوی مال ہوتا ہے۔ جس کا لالچ دے کر وہ ان کو اپنے مذہب میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں"۔ کسی مہاتما پرش کا کام نہیں کہ وہ اس قسم کے بے بنیاد الزام سے کسی کو مطعون کرے۔ لیکن مسٹر گاندھی نہایت بے باکانہ طورپر منہ زوری سے کلیسیائے ہند کی جماعت کو بدنام کرتے ہیں۔

ع جرم ناکردہ خطا واربنے بیٹھے ہیں

غالباً اُن کا یہ خیا ہے کہ جس طرح وہ اوردیگر ہنود جواُن کے رفقائے کار ہیں غریب اچھوتوں کو لالچ دے کر سبز باغ دکھاتے ہیں اُسی طرح مسیحی کلیسیا کے مبلغین بھی مسیحی جماعت کی اقتصادی اورسیاسی ترقی کی خاطر ہرممکن ذریعہ سے اپنی تعداد وشمار کوبڑھانا چاہتے ہیں۔ سچ ہے

فکر ہرکس بقدر ہمت اوست

اگرگاندھی جی چاہتے ہیں کہ مسیحی جماعت ان کو سلیم العقل شخص جانے توان پر لازم ہے کہ بے سوچے سمجھے اس پر سنگین الزام لگانے سے بازرہیں اوراس قسم کی پادرہوا باتوں سے احترازکریں۔

٦

مسٹر گاندھی آخر وکیل ہیں۔ پس وہ مسیحی لیڈروں کے بیان کے الفاظ" فرض" اور"حق" پر وکیلانہ بحث اورجرح کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب مسیحی کہتے ہیں کہ کلیسیاکا یہ " فرض " ہے کہ وہ ہرفرد بشر کونجات کا پیغام سنائے توان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں پر جبرکرکے زبردستی ان کو مسیحیت کا حلقہ بگوش بنالیں۔ ایسا مضحکہ خیز رویہ ان کے مذہب کے بنیادی اصولوں

کے خلاف ہے۔ مسیحی کلیسیا کا یہ "حق" ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کو اپنے دائرہ کے اندرداخل کرے جومنجئی کونین پر ایمان لا چاہتے ہیں۔ اوران کو تعلیم دے کراُن کی روحوں کی نگہداشت اورپاسبانی کرے۔ اوریہ "حق" کلیسیا کو اس کے خداوند کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اوراس پر یہ"فرض" کردیا گیاہے کہ وہ ہر فرد بشر کوجوذی روح ہے اجس کی روح کی نجات کا پیغام سنائے اورروئے زمین کی کوئی طاقت کلیسیا کو اس پیغام کے سنانے سے بازنہیں رکھ سکتی۔ اورنہ کسی ملک وزمانہ کی عدالت اس فرض کے خلاف کوئی حکم صادرکرکے اُس سے جبریہ منواسکتی ہے۔

۷

حق تویہ ہے کہ اس قسم کی باتیں ہمیں مجبورکرتی ہیں کہ ہم یہ کہیں کہ مسٹرگاندھی ہندی قوم کے حامی نہیں بلکہ ہندوفرقہ وارانہ خیالات کے موید ہیں اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے خالی نہیں ہیں۔

ع میں الزام اُن کو دیتا تھا قصوراپنا نکل آیا

مسٹرگاندھی بچارے مسیحی مبلغین کوکمزورسمجھ کر ان کو ملک بدرکرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔لیکن ان کو یہ جرات نہیں ہوتی کہ وہ اہل اسلام کے مبلغین کوزجروتوبیخ کریں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں اورمانتے ہیں کہ اہل اسلام کی ذہنیت فرقہ وارانہ ہے اوروہ اپنی جماعت کی تعداد کوبڑھانے کی خاطر تبلیغ کا کام سرانجام دیتے ہیں تاکہ وہ ہندوؤں کے اقتصادی غلبہ اورسیاسی اقتدارکو توڑدیں۔ان کا محتاط رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ گیدڑبھبھکیاں صرف ایک ایسی جماعت کو سنائی جاتی ہیں جن کو وہ بزعم خود کمزوراورضعیف خیال کرتے ہیں۔اورآنکھ کھول کر اس حقیقت کو نہیں دیکھتے کہ ہندوستانی مسیحی محبِ وطن اورقوم کے شیدائی ہیں۔ اُن میں فرقہ وارانہ ذہنیت سرے سے ہی نہیں۔مسیحیت دن دوگنی اوررات چوگنی ترقی کررہی ہے۔کیونکہ وہ ہر کس وناکس کی روحانی بھوک کو پوراکرتی ہے۔ مسٹرگاندھی خیال کرتے ہیں کہ غریب "ہریجنوں" کے اندرروحانی بھوک موجود نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ درحقیقت ان کے دل میں بچارے اُچھوت ذاتوں کی روحوں کے لئے تڑپ اوردرد نہیں ہے۔ چنانچہ جب انٹرنیشنل مشنری کانفرنش جس کے ماتحت کل دنیا کی تین سو سے زیادہ پروٹسنٹ مشنری سوسائٹیاں ہیں)۔ کے چئیر مین ڈاکٹر موٹ نے (Dr.Mott) ۱۹۳۶ء میں مسٹرگاندھی سے ملاقات کی اورکہاکہ سیدنا مسیح نے ہر مسیحی پر

لازم کردیا ہے کہ وہ اچھوتوں کو انجیل کا پیغام دیں۔ تومسٹر گاندھی نے جواب میں کہا:

" ڈاکٹر موٹ کیا آپ گائے بیلوں کو انجیل کا پیغام دے سکتے ہیں۔ اچھوت توان حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ ہندوازم اسلام اورمسیحیت میں تمیز کرسکیں۔ ان میں سرے سے یہ سمجھ اورعقل ہی نہیں کہ یسوع اور محمد اور اورنانک وغیرہ میں تمیزکرسکیں۔

۸

مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے کہ مسٹر گاندھی اچھوت اقوام کو بنظر حقارت اورنفرت دیکھتے ہیں۔اچھوت ادھار کی تحریک سے (جیسا ان کے مرن برت سے ظاہر ہے) ان کاواحد مقصدیہ ہے کہ ان کو کسی نہ کسی طرح ہندوجماعت سے باہر نہ نکلنے دیں۔ تاکہ ہندود کے اقتدارکوضعف نہ پہنچے اورہندوؤں کی اکثریت برقرار ہے بے خودی بے سبب نہیں غالب کچھ توہے جس کی پردہ داری ہے۔ حالانکہ بچارے انیس کروڑ اچھوت اقوام کسی لحاظ سے بھی ہندونہیں ہیں۔ نہ ان کی نسل ہندوؤں کی ہے۔ نہ ان کا مذہب ہندوؤں کا مذہب ہے۔ نہ اُن کی تاریخ اورکلچر (ثقافت) ہندوؤں کی ہے۔ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کی آمد سے پیشتر بستے تھے۔ اُن کے معبود ہندوؤں کے معبود نہیں بلکہ وہ مذھباً(Animist) ہیں۔ ہندوؤں کے سوشل نظام میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔کیونکہ ہندوؤں کی صرف چارذاتیں ہیں اوراچھوت ان چاروں میں سے کسی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ پس درحقیقت سرکارِبرطانیہ حق بجانب تھی۔ جب اس نے فرقہ وارانہ تناسب میں ان کو ہندوؤں سے الگ شمارکیا تھا۔ مسٹر گاندھی نے مرن برت کی دھمکی دے کرہندوؤں کے اقتدارمیں فرق نہ آنے دیا۔ پر غریب اچھوت اقوام کے لئے وہ کچھ نہیں کرنا چاہتے۔بڑی سے بڑی بات جوگاندھی جی ان مظلوم اچھوتوں کے لئے کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ان کو مندروں کے اندرداخل ہونے کی اجازت مل سکے۔لیکن بفرض محال اگر ان کو یہ اجازت مل بھی جائے تووہاں داخل ہوکر وہ اپنی روحانی بھوک اور پیاس کو کس طرح مٹاسکیں گے؟ ان مندروں میں سوائے بتوں کے اوررکھاہی کیا ہے۔ اورخود یہ مصلحین اس بات کے قائل ہیں کہ بُت پرستی ایک ایسا گناہ ہے جوہندوستان کے حق میں طوقِ لعنت ثابت ہواہے۔ ہندوستانی مسیحی مبلغین یہ چاہتے ہیں کہ بچارے اچھوت اقوام کے لوگ اپنے اور ہندومت کے فرسودہ

عقائد اورباطل خیالات کوترک کریں اورتاریکی سے نکل کر آفتابِ صداقت کی روشنی میں زندگی بسرکریں ۔ کیایہ گنا ہے؟

۹

یہاں ایک اوربات قابلِ غور ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ اچھوت گائے بیلوں سے بدتر ہیں اوران میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ ہندوازم ۔اسلام اورمسیحیت کے عقائد میں تمیزکرسکیں اوریسوع اورمحمد اورنانک وغیرہ میں تمیزکرنے کی ان میں سمجھ ہی نہیں۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتاہے کہ مسٹر گاندھی کے خیال میں ان مذاہب میں درحقیقت فرق عظیم ہے۔اوران مذاہب کے بانیوں کی زندگیاں یکساں قدرومنزلت والی نہیں ہیں۔ اوران مذاہب میں اوران کے بانیوں میں امتیازکرنا گویا حیوانوں کاکام ہے۔

ع کفرٹوٹا خدا خداکرکے

ہم مسٹر گاندھی سے یہ سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس صورت میں تمام مذاہب کس طرح برابر طورپر حق ہوئے اوران کے بانی کس طرح یکساں طورپر قدروو بعت رکھنے والے ہیں۔ لیکن یہی وہ قضایا ہیں جن کا وہ باربار اعادہ کرتے رہتے ہیں۔

ع توآپ اپنے دام میں صیاد آگیا

سچ ہے حق برزبان جاری ے گردو

۱۰

اگرمختلف مذاہب میں درحقیقت کوئی فرق نہیں ہے اوروہ سب برابر طورپردرست اورراست ہیں تومسٹر گاندھی کیوں تبدیلی مذہب کے جانی دشمن ہیں۔ ان کی مخالفت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ مانتے ہیں کہ ان مذاہب میں حقیقی اوربنیادی اختلافات ہیں۔ اوران میں تمیز نہ کرنے والا حیوانوں کی سی عقل اورسمجھ رکھتاہے ۔یہی وجہ ہے کہ مسیحی کلیسیا اس قسم کے خرافات کونہیں مانتی اورنہ مان سکتی ہے۔ مسیحیت کا مذہب قطعی اورآخری مکاشفہ ہے۔ جوادیانِ عالم کے اصولوں کوجانچتا پرکھتا اوران کی عدالت کرتاہے۔ وہ اس قسم کا مکاشفہ نہیں جو دیگر مذاہب میں ہے۔ وہ دیگرمذاہب سے نہ صرف درجہ میں فرق ہے بلکہ جیسا ہم باب اول میں دکھاچکے ہیں ان میں اوراس میں نوعیت کا فرق ہے۔دیگر مذاہب مسیحیت کی سی قسم کے مذہب میں اورنہ ان کے بانی سیدنا مسیح کی سی قسم کے اشخاص ہیں۔ چونکہ مسیح اورصرف مسیح راہ حق اورزندگی ہے۔ لہذا دوسرے مذاہب کے بانی راہ حق اور زندگی نہیں ہوسکتے ۔ یہ مسیحی ایمان ہے جس کا ہر مسیحی

ایماندار بے دھڑك ہرفردبشر کے سامنے اعلان کرتا ہے۔ مسیحیت کے مطابق خدا خود گنہگارانسان کی نجات کی خاطر پیش قدمی کرتا ہے (۱یوحنا ۴: ۱۰ وغیرہ) کوئی دوسرا مذہب یہ صداقت اس احسن طریق پر پیش نہیں کرتا۔ مسیحی طریقہ نجات ہندوازم کی طرح کسی انسان کی دماغی اختراع اوربیسود روحانی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہندوستانی کلیسیا اس مکاشفہ کی علم برداراورمناد ہے۔ جس کا فرض یہ ہے کہ اس حق کا اعلان کرے۔

۱۱

مدراس کے ہفتہ واراخبارگارڈین نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۹ فروری ۱۹۴۰ء میں اس ملاقات کا بیان شائع کیا تھا جومسٹرسی۔ پی۔ میتھیو نے مسٹرگاندھی سے کی تھی۔ یہ بیان جس کی صحت پر مسٹر میتیھو اورمسٹر گاندھی دونوں متفق ہیں۔چند ایك پہلوؤں سے نہایت معنی خیز ہے۔ کیونکہ اس سے مسیحی کلیسیا کو یہ پتہ لگتا ہے۔ کہ مسیحیت کی اشاعت اورتبدیلی مذہب کے بارے میں مسٹر گاندھی کا تازہ نقطہ خیال کیا ہے۔ مسٹر میتھیو نے مسٹرگاندھی کے سامنے راسخ الاعتقاد مسیحی نقطہ نظر پیش کرکے کہا:

"ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا دنیا میں انسان کی شکل اختیار کرکے آیا اوروہ انسان یسوع مسیح ہے جودوسرے نبیوں ، معلموں، اورمذاہب کے بانیوں کے ساتھ ایك ہی قطارمیں نہیں ہے۔ خدا کی نظر میں سب انسان گنہگارہیں۔ لیکن صرف یسوع مسیح ہی بے گناہ اوربنی نوع انسان کا نجات دہندہ ہے۔اس نے نہ صرف ایك پیغام چھوڑا بلکہ ایك دیدنی جماعت بھی قائم کی۔ جس میں اُسکے حواری اورایماندار شامل تھے۔ وہ اندرونی ایمان اوربیرونی ساکرامنٹوں کے ذریعہ ایك دوسرے سے وابستہ تھے۔ یہ ہمارا فرض اورحق ہے کہ تمام لوگوں کوخواہ وہ امیر ہوں خواہ غریب ۔ عالم ہوں یا جاہل۔ اونچی ذات کے ہوں یا ہریجن دعوت دیں کہ وہ مسیح کو اپنا منجی اورخداوند مانیں اوراس کے بدن یعنی کلیسیا کے عضو بن جائیں۔یہ کام ہم اپنے اقوا ل وافعال سے اوراپنی زندگی سے سر انجام دینا چاہتے ہیں۔ اوریہ ہمارے مذہبی فرائض کا جزو لا ینفك ہے۔ اگرہم کوایسا کرنے کی آزادی نہیں توہم خیال کرتے ہیں کہ ہم کو مذہبی آزادی حاصل نہیں۔کیا اُس ہندوستان میں جو آپ قائم کرنا چاہتے ہیں ہم مسیحیوں کی یہ آزادی ہوگی؟ یا کیا آپ کی قومی گورنمنٹ اس معاملہ میں ہم کو روکے گی؟

گاندھی جی نے جواب میں کہا کہ کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ لیکن میں اس قسم کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ پس میں ایک فرد کے طورپر آپ کے تبلیغی کام کی مخالفت کرونگا۔ جس طرح آپ کو یہ آزادی حاصل ہے کہ آپ اپنے نقطہ نگاہ کی اشاعت کریں اسی طرح مجھے آزادی حاصل ہے کہ میں آپ کی مخالفت کروں میں نے کہا کہ یہ بات قرین انصاف ہے۔ لیکن کیا آپ انجیل کی اشاعت کے خلاف اپنا سیاسی اقتدار کا حربہ استعمال کرینگے ؟ اُنہوں نے جواب کے حائل ہونے کے خلاف ہوگا۔ مسٹر میتھیو نے کہا کہ بعض اوقات ہندو لیڈر اصولاً تبلیغ واشاعت کی طریقوں کو جانچیگی اوریوں جوگورنمنٹ مسیحیت کے خلاف ہوگی وہ اس بہانہ سے تبلیغ واشاعت کوروک سکتی ہے کہ اس سے فرقہ وارانہ نفاق کا ایا امن عامہ میں خلل کا اندیشہ ہے۔ کیا آپ ہم کو یہ یقین دلواسکتے ہیں کہ جس طرح ہم کو برطانوی حکومت کے زیرسایہ آزادی حاصل ہے اُسی طرح ہم کو قومی گورنمنٹ میں بھی آزادی حاصل ہوگی؟ اس پر گاندھی جی نے کہا کہ:

"میں یہ یقین نہیں دلواسکتا ۔ کیونکہ میں ان طریقوں سے ناواقف ہوں جو برطانوی حکومت کے زیرسایہ آپ آزادانہ استعمال کرتے ہیں۔ میں صرف یہ کہہ سکتاہوں کہ آپ کو جائز اورمناسب آزادی دی جائیگی لیکن اگرآپ مجھ سے اس کا مطلب دریافت کریں تواس کو میں یوں واضح کرتاہوں کہ اگرآپ اپنے پیغام کی اشاعت کریں تویہ جائز ہوگا لیکن اگرآپ کسی ہریجن کوخفیہ طورپر گھر لے جائیں۔ اس کو کھانا اورکپڑا دیں اورلالچ دے کر اس کو اپنے مذہب میں داخل کرلیں تومیں اس کو ناجائز خیال کرتاہوں۔ میں نے جواب دیاکہ ہم مسیحی اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ اچھی چیزوں میں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی حصہ لگاتے ہیں اوراس کو لالچ کہنا غلطی ہے۔ مسٹر گاندھی نے کہا کہ کسی شخص کو دنیاوی مددینا اوراپنے مذہب میں داخل کرنا رشوت دینا ہے اوریہ محزبِ اخلاق ہے۔

۱۲

ڈاکٹر پرنچ بھی اسی وقت ہندوذہنیت کا مظاہرہ یوں کرتے ہیں کہ:

"آپ نے بمبئی لیجلیٹو کونسل میں تبدیلی مذہب کی قانونی روک تھام کے لئے ایک بل تیارکیا تھا جس کی رُو سے تمام مذہبی تبدیلیاں جودغایا فریب یاجبر سے عمل میں آئیں سزا کا مستوجب ہوں گی۔ جماعتوں اورمجمعوں اورنابالغوں کو قانوناً تبدیلی مذہب

سے روکا جائے گا۔ ہرشخص کو تبدیلی مذہب کی اجازت ہوگی۔ بشرطیکہ وہ بیماریامفلس نہ ہو یا اس کا دماغ کمزورنہ ہو۔اس بل کے مطابق مذہب کی تبدیلی کومجسٹریٹ رجسٹر کریگا۔ اورمجسٹریٹ کوخاص طورپر یہ خیال رکھنا ہوگاکہ تبدیلی صرف مذہبی اصول کی وجہ سے عمل میں آئے اورمذہب کوتبدیل کرنے والا اپنے قول اورفعل کے اُونچ نیچ کواچھی طرح سے سمجھتاہو" (انڈین سوشل ریفارمر ۱۸ مئی ۱۹۴۰ء)۔

۱۳

مسٹرگاندھی کے مندرجہ بالا بیان کے متعلق مسیحی کلیسیا کوذیل کے امورمدِنظر رکھنے چاہیں:

اول: گاندھی جی کہتے ہیں کہ وہ مسٹر میتھیو کے تصورِ مسیحیت کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے ۔ جس سے ان کا یہ مطلب ہے کہ وہ مسیحیت کے کسی ایسے تصور کے ساتھ متفق نہیں جوکلمتہ اللہ کوخداکا آخری قطعی اورکامل واکمل مکاشفہ نے مسٹر گاندھی کواختیار ہے کہ سیدنا مسیح اورمسیحیت کی نسبت جوچاہیں مانیں۔ لیکن ان کا ذاتی عقیدہ مسیحی عقیدہ کہ مسٹرگاندھی مسیحی کلیسیا کویہ بتلائیں کہ وہ کیا جانے ، چونکہ مسٹرگاندھی اہل ہنود کے چوٹی کے لیڈرہیں اس واسطے ان سے ملاقات کرنے کا یہ مقصد تھا کہ اہل ہنود جن کی ہمارے ملک میں اکثریت ہے۔ مسیحی عقائد اورمسیحیت کی اشاعت اورتبدیلی مذہب کوسیاسی نکتہ نگاہ سے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

صحیح سیاسی نکتہ نگاہ سے ان سوالات کا جواب ظاہر ہے جمہوریت کے اصول کے مطابق ہر شخص آزاد ہے کہ وہ بے خوف ہوکر اپنے خیالات کااظہارکرے اوربغیرکسی رکاوٹ کے اپنے اصول کی تبلیغ کرے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ آزادی کسی دوسرے شخص کے خیالات کے اظہاروتبلیغ کی آزادی میں خلل اندازہو۔اگراس قسم کی آزادی کا انکارکیا جائے تو جمہوریت کے اصول محض ایک ڈھکوسلہ رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طورپر اسلام اورہندومت کے بعض مبلغین امریکہ یا برطانیہ میں جاتے ہیں۔ اوروہاں اسلام یا ویدانت کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ لیکن ان ممالک میں کسی شخص کے وہم وگمان میں بھی نہیں آتا کہ قانون کے ہتھیار سے ان تبلیغی کوششوں کی روک تھام کرے۔ کیونکہ ان ممالک کے لوگ جمہوریت کے شیدائی ہیں۔ جن کے لئے آزادی کے اصول محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ ان ممالک میں آزادی کے اصول ان کی سیاسیات کی بنیاد ہیں۔ جمہوری اصول

کے مطابق ہرشخص آزاد ہے کہ وہ اپنے مذہب یا لامذہبی کے اصول کی یاکسی فلسفہ یا مجموعہ خیالات کا اظہاروتبلیغ کرے اوراُن پرعمل بھی کرسکے۔

۱۴

پس مسٹر گاندھی بجا کہتے ہیں کہ مسیحیت کی جو تبلیغ خلوص نیت کے ساتھ کی جائے اس پر کوئی قانونی یا سیاسی قید نہیں لگ سکتی۔ لیکن مطلبِ سعدی دیگراست۔ الفاظ" خلوص نیت" کے پردے اورآڑمیں ضمیر کی آزادی اورمذہب کی آزادی کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹ ڈالی جاسکتی ہے۔ یہ کس طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ فلاں شخص اپنے خیالات کااظہار اوران کی اشاعت "خلوص نیت" سے کررہاہے۔اورفلاں" خلوصِ نیت" سے نہیں کرتا؟ سیاست دان کا کام" نیت" سے نہیں بلکہ" ملک کے انتظام سے ہے تاکہ کوئی شخص کسی دوسرے کے جائز حقوق اورآزادی میں مخل نہ ہو۔ ورنہ حاکمِ وقت کوایک محکمہ احتساب قائم کرنا پڑے گا جوجمہوریت کے منافی ہے۔

۱۵

جوبیان شائع کیا گیا ہے اُس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "مبلغین" سے گاندھی جی کا مطلب پردیسی مبلغین سے ہے۔ آپ بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان میں لاکھوں مسیحی بستے ہیں اوراُن میں سے ہرایک مسیحی کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ مسیح اورمسیحیت کی تبلیغ کرے۔ اوران لاکھوں ہندوستانی مسیحی مبلغین کا یہ حق ہے کہ وہ ہندوستان میں بودوباش کریں۔ جس طرح کروڑوں ہندوؤں کا یہ حق ہے کہ وہ ہندوستان میں سکونت کریں ۔ کیونکہ دونوں کی جنم بھومی ایک ہی ہے۔اگرپردیسی مبلغین مسیحیت پر قانونی قیود عائد کی جائیں گی تووہ قیود ہندوستانی مسیحیوں سے اُن کا حق تبلیغ چھین نہیں سکتیں۔ اوراگر کوئی قانونی پابندی عائد کی گئی توہرہندوستانی مسیحی کا فرض ہوگاکہ وہ ایسے خلافِ مذہب قوانین کی خلاف ورزی کرے۔

۱۶

مہاتما جی کویہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ اگراشاعت وتبلیغ پرپابندیاں عائد کی گئیں تویہ پابندیاں نہ صرف مسیحیوں پر ہی عائد ہونگی بلکہ آریہ سماج اوراسلام بھی ان کے ماتحت ہونگے اوراُن کوبھی

اختیار ہوگا کہ کسی مسیحی کو ہندودھرم یا اسلام میں داخل کریں۔ کیا اس قسم کی قانونی پابندیاں فرقہ دارانہ جھگڑوں کا خاتمہ کرنے اورقوم کویک جا کرنے کی بجائے نِت نئے جگھڑے برپا کرے اورقوم کا شیرازہ بکھیرنے کا باعث نہ ہونگی؟

۱۷

گاندھی جی کہتے ہیں کہ " تم کومناسب آزادی دی جائیگی" کیا ایک مہاتما پرش کو یہ سجتاہے کہ اس قسم کے تحکمانہ انداز کواختیارکرے؟ ابھی تواصل خیر سے ملک کوآزادی بھی حاصل نہیں ہوئی اورمہاتما جی خیال کرتے ہیں کہ مسیحیت اُن کی مٹھی میں ہے۔ اس کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ وہ یہ فراموش کردیتے ہیں کہ ان کو تصرف ایک موہومہ اختیارحاصل ہے کہ مسیحیت کے ساتھ جوچاہیں کریں۔ لیکن ہندوستان کے لاکھوں مسیحیوں کو یہ حقیقی اختیارحاصل ہے کہ وہ اپنے فرض کو پہچان کر مسٹر گاندھی جیسے مہاتما پرشوں کی لن ترانیوں کی پروانہ کرکے ہندوستان کو مسیح کا حلقہ بگوش بنادیں۔

ہم حیران ہیں کہ جب ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ایک شے کو پسند کرکے قبول کرتے اور دوسری کو ناپسند کرکے ردک کرتے ہیں تومذہب جیسے اہم معاملہ میں جو درحقیقت زندگی اورموت کا سوال ہے ۔ ہم کوسچے اصولوں کو پسند کرکے رد کرتے ہیں تومذہب جیسے اہم معاملہ میں جو درحقیقت زندگی اورموت کا سوال ہے۔ ہم کوسچے اصولوں کوپسند کرنے اورباطل اصولوں کوترک کرنے سے کیوں روکا جاتا ہے؟

مسٹرگاندھی لفظ" مناسب آزادی" کویوں واضح کرتے ہیں "تم کویہ اختیار ہے کہ اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ لیکن اگرتم خفیہ طورپر کسی ہریجن کواپنے گھربلاکرکھانا اورکپڑا دواوراس کے لالچ کا ناجائز فائدہ اٹھاکر اس کو مسیحی بنالو تومیں اس قسم کے فعل کوخلاف قانون سمجھونگا" ہم سمجھ نہیں سکتے کہ مسٹر گاندھی جیسے دل ودماغ رکھنے والے مسیحیت کی تبلیغ کی نسبت کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں؟ مسیحیت کی تبلیغ واشاعت میں"خفیہ" مساعی کوکسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ آپ نے غریب ہریجن کوایک " لالچی" شخص بنادیا ہے۔جس کو ہریجن سیواسنگھ اورمسیحی کلیسیا دونوں اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اورجوکھانے اورکپڑے پر اتنا مرتا ہے کہ اُن پر اپنے مذہب کو قربان کرنے کو تیار ہوجاتا ہے۔ یا شاید گاندھی جی کا خیال ہے کہ مسیحی مبلغین ہریجن " خفیہ طورپر" اغوا کرکے اپنے

گھروں میں لے جاکر بپتسمہ دے دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ گاندھی جی کی ناواقفیت اورقوتِ متخیلہ ان سے کیا کیا مضحکہ خیز کلمات کہلوائیگی ۔ چنانچہ آپ ایک اورمثال دیتے ہیں" فرض کروکہ آپ خفیہ طورپر ایک شخص کو سیگاؤں سے ڈراونکوبھگا کرلے جائیں" ۔ مہاتما جی بھول جاتے ہیں کہ مسیحی مبلغین اغوا کرنے والوں کی جماعت نہیں ہے۔ اورجس قسم کی حرکات کاغیر مسیحی لیڈروں ۱۹۲۰ء میں نان کواوپریشن کے زمانہ میں ارتکاب کیا تھا اورنابالغ بچوں کواوربے سمجھ نوجوانوں کو سکولوں اورکالجوں سے نکالا تھا۔ اوریوں اُن کے بے سمجھی کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اس قسم کی حرکات مسیحی مبلغین سے سرزد نہیں ہوتیں اوروہ نابالغوں کونکال بھگا کرنہیں لے جاتے۔

ہم مسٹر گاندھی اوراُن کے ہم خیالوں کوایک تازہ وا ٖقعہ یاددلاتے ہیں۔ گذشتہ سال ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد کی ریاست کے شمال مشرقی حصہ میں سخت قحط پڑا۔ گورنمنٹ نے ان قحط زدوں کی امداد کرنے میں کاہلی سے کام لیا۔ پس وہاں کے مشنریوں نے اس کارِخیر کوشروع کیا اوروہ سرکاری افسروں ، تاجروں، زمینداروں سے قحط زدوں کی امداد کے خواہاں ہوئے۔ لیکن باستشنائے چند افراد کسی نے ان کی اپیل کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ لیکن یہ بلند ہمت مشنری اس قسم کے رویہ سے اپنے عزم بالجزم سے بازنہ آئے اوراُنہوں نے ان قحط زدہ بیچارگاں کی امداد کا تہیہ کرلیا۔ اورپانچ مرکزوں میں پانچ ہزارآدمیوں کوچھ ماہ تک روزانہ کھانا کھلاتے رہے۔ غیر مسیحی برداران کے رویہ کے خلاف وہ حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لائے۔ اُنہوں نے ان قحط زدہ اشخاص کوکبھی نہ کہاکہ" دیکھو تمہارے ہم مذہبوں نے تمہاری پرواہ تک نہیں کی۔ تمہارے دیوتاؤں نے تمہاری دعاؤں کو نہیں سنا۔ گورنمنٹ نے تمہاری مدد نہیں کی۔سرمایہ دار تاجروں اورزمینداروں نے تم کو نہیں پوچھا۔ صرف مسیحیوں نے تمہاری امداد کی ہے"۔ مسٹرگاندھی کے خیال کے مطابق وہ ہزاروں کوبپتسمہ دے کر مسیحیت کے حلقہ بگوش کرسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے قحط زدہ اشخاص کی ضروریات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا۔ اورایک شخص کو بھی بپتسمہ دے کر مسیحی جماعت میں شامل نہ کیا۔

(انڈین سوشل ریفارمر بابت ۲۳مارچ ۱۹۴۰ء)۔

خنر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مسٹرگاندھی ہندوستانی مسیحیوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم خاموش مسیحی زندگی بسر کرو اوراس زندگی سے ہم وطنوں پر اثر ڈالو۔لیکن انجیل جلیل کا سرسری مطالعہ ہم پر ظاہر کردیتا ہے کہ یہ مشورہ خداوند کی منشاء کے خلاف ہے۔ جب ہم کلمتہ اللہ کی زندگی اورنمونہ پر غورکرتے ہیں توہم دیکھتے ہیں کہ گوسیدنا مسیح کی زندگی کامل تھی تاہم آپ نے اپنے کامل نمونہ دینے پراکتفا نہ کی۔ آپ نے اپنی کامل زندگی کے خاموش پیغام پر کبھی قناعت نہ کی۔ کوئی مسیحی خداوند کی سی کامل زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ کیونکہ کوئی " شاگرد اپنے استاد سے بڑا نہیں ہوتا" (متی ۱۰: ۲۴)۔ پس جب کلمتہ نے کامل نمونہ ہونے کے باوجود خاموش زندگی پر قناعت نہ کی(مرقس ۲: ۳۸ وغیرہ) حالانکہ ہزاروں اشخاص آپ کے نمونہ سے متاثر تھے(مرقس ۵: ۳۱۔ متی ۵: ۱۔ یوحنا ۶: ۵ وغیرہ) توماوشما جن کی زندگیاں غیر مکمل ہیں کس طرح محض خاموش گواہی پر قنادت کرسکتے ہیں ؟ کتاب اعمال الرسل سے ظاہر ہے کہ خداوند مسیح کے رسولوں نے یہ وطیرہ کبھی اختیار نہ کیا۔ بلکہ خود کلمتہ اللہ نے اورآپ کے رسولوں نے اپنے پیروؤں پر یہ فرض کردیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے افعال سے اپنے منجئی کوظاہر کریں بلکہ اپنے اقوال سے اس کا اقرارکریں (متی ۱۰: ۳۲۔ رومیوں ۱۰: ۹) پس ہم کلمتہ اللہ کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کرکے مسٹرگاندھی کے مشورہ کومردہ سمجھتے ہیں۔

اگربنیم کو نہ بینا وچاہ امت
وگرخاموش ہنشینم گناہ است

خدا کا حکم ہے" گلا پھاڑکرچلا۔ دریغ نہ کر۔ نرسنگھے کی مانند اپنی آوازبلند کرو اورلوگوں پر ان کے گناہوں کوظاہر کر"(یسعیاہ ۵۸: ۱)۔ مسٹر گاندھی کے برعکس مقدس پولوس صاف طورپر فرماتے ہیں۔"ایمان سننے سے پیدا ہوتا ہے لیکن جس کا ذکر اُنہوں نے نہیں سنا اس پر ایمان کیونکر لائیں اوربغیرمنادی کرنے والے کے کیونکر سنیں"؟ (رومیوں ۱۰: ۱۴)۔ خود خداوند مسیح اورآپ کے رسول مشنری اورمبلغ تھے۔ (مرقس ۲: ۳۸۔ لوقا ۱۰: ۱ وغیرہ)۔ اگرآپ کے مبارک رسول صرف خاموش زندگی بسرکرنے پر ہی قناعت کرتے اورمنادی کرنے کا فرض (اعمال ۱: ۸ وغیرہ)۔ادا نہ کرتے تومسیحی کلیسیا کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔ مسیحیت کی اشاعت کی وجہ یہ تھی کہ منجئی کونین کے شاگرد نجات کی بشارت کے پیغام کولوگوں تک

پہنچانا اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتے تھے(افسیوں ۶: ۲۰۔ رومیوں ۱۵: ۲۰۔ وغیرہ) اورانجیل کی منادی کے حکم کی تعمیل کرنا سعادت دارین کا باعث خیال کرتے تھے(متی ۱۸: ۱۸ تا ۲۰۔ - ۱۸: ۱۹۔ لوقا ۲۴: ۴۷تا ۴۹ ۔ یوحنا ۲۰: ۲۱تا ۲۳۔ ۲۱: ۲۱تا ۲۳۔ ۲۴: ۴۷ ۔ اعمال ۱: ۴تا ۸ وغیرہ)۔جب ہم نے خدا کی محبت کا جومسیح میں ہے ذاتی تجربہ کرلیا ہے اورخدا کی نجات سے بہرہ ورہوگئے ہیں توہم کس طرح خاموش رہ کر لاکھوں انسانوں کو لاپروائی سے ہلاکت کی طرف جاتے دیکھ سکتے ہیں کیونکہ " گناہ کی مزدوری موت ہے"؟ (رومیوں ۶: ۲۳)ان گنہگاروں کوبھی اُسی اطمینان اورشانتی کی ضرورت ہے جوہم کو حاصل ہوگئی ہے۔ پس جوشخص جان بوجھ کر ایسے انسانوں کو" اس بخشش سے جوہمیشہ کی زندگی ہے(رومیوں ۶: ۲۳۔) محروم رکھتا ہے۔ وہ اپنے افعال سے ثابت کردیتا ہے کہ اس نے الہٰی محبت کا تجربہ نہیں کیا۔ کیونکہ محبت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی خوشی میں شریك کرتی ہے(۱یوحنا ۱: ۳) پس کوئی شخص الہٰی محبت ونجات کی بخشش کوحاصل کرکے خاموش نہیں رہ سکتا۔ منجئی کونین کا یہ حکم ہے کہ" تم نے مفت پایا مفت دو" پس مسیحی ہونا اورمسیحیت کا مبلغ ہونا درحقیقت مترادف الفاظ ہیں۔

عاشقی چیست بگومگربندہ جانال بودن

ہرمسیحی ایماندارمنجئی کونین کی نجات کا مبلغ ہے۔ چونکہ اس نے خداوند مسیح کی محبت کے مطلب اورمقصد کو جان لیا ہے اوراس بات کا تجربہ کرلیا ہے کہ خدا نے اپنی بے قیاس محبت سے مجھ گنہگار کوتلاش کیا ہے(لوقا ۱۵باب)لہذا یہ میرا فرض ہے کہ مین دوسرے گنہگاروں پر بھی ظاہرکردوں کہ خدا کی لازوال محبت ان کی بھی تلاش کرتی ہے۔ (۱یوحنا ۴: ۹ وغیرہ) کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ" میں اس لئے آیاہوں کہ انسان زندگی پائیں اورکثرت سے زندگی پائیں"(یوحنا ۱۰: ۱۰)۔ ہرہندوستانی مسیحی عاجزی سے خدا کا شکر کرتا ہے کہ اس کو زندگی ملی ہے(یوحنا ۱: ۴، ۱۷ وغیرہ)پس اس کی خلوص نیت سے یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کوجومردہ ہیں اس نجات کا پیغآم دے تاکہ وہ بھی کثرت سے زندگی پائیں " اورہمارے ملك وقوم ہند کی ترقی ہو۔ ہم مسیح کے بغیرزندہ نہیں رہ سکتے (یوحنا ۱۵: ۱۵) اورہم اس کی برداشت نہیں کرسکتے کہ اس کے بغیراس دنیا کا کوئی شخص بھی زندگی بسرکرے۔ ہم جوبھی

ہیں ایسی دنیا کا تصور بھی نہیں کرسکتے جس میں ایسے انسان بستے ہوں جو گنہگار ہوں اورجن کی رُوحیں پیاسی ہوں اوروہ" آب حیات" (یوحنا ۷: ۳۷) سے محروم رکھیں جائیں۔ جب خدا نے انسان کی نجات کا انتظام کیا تواُس نے کسی ملک یا قوم یافرد کو اُس سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ ہم کون ہیں کہ ہم خاموش رہ کر اس نجات کے پیغام سے دوسروں کو محروم کریں؟ یہ زندگی کا پیغام ہمارا نہیں کہ ہم کو اختیار ہو کہ اس کااعلان کریں یا نہ کریں۔مسیحی نجات کی پیغام بری کا حکم خود پیغام کے اندر مضمر اورموجود ہے۔ نجات کا یہ پیغام الہٰی پیغام ہے اورخود خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے۔اورخدا کے حکم کے سامنے ہم مسٹرگاندھی کے مشورہ کوکہ خاموش مسیحی زندگیوں سے دنیا کو متاثر کرو بے حقیقت سمجھتے ہیں۔

مسٹر گاندھی کانگریسی خیالات کے پرچار کے معاملہ میں کیوں اپنی اصلاح پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔کانگریس کے اخبارات کیوں جاری ہیں کانگریس کے کارندے کیوں خاموش زندگیاں بسر کرنے پر قناعت نہیں کرتے ؟ مسٹرگاندھی آج کل تقریر کی آزادی کی خاطر کیوں گورنمنٹ سے الجھ کر ہزاروں کو جیل خانہ بھیج رہے ہیں؟ خداوند مسیح کا نمونہ اورآپ کے سنہری اصول ہم کو دنیا کے تمام سیاسی مفکرین کی دریوزہ گری سے بے نیاز کردیتے ہیں۔

۱۹

حق تویہ ہے کہ تبدیلی مذہب کے بارے میں ہمارے غیر مسیحی ہم وطن ایک ایسا وطیرہ اختیار کرتے ہیں جوتنگ دلی بے انصافی اورتعصب پر مبنی ہے۔ ایک طرف تووہ ان شخاص کو اپنی جماعت سے خارج کردیتے ہیں جو مسیحیت کہ حلقہ بگوش ہوجاتے ہیں اورلطائف الحیل سے ان پر ظلم وستم کرکے ان پر عرصہ حیات تنگ کردیتے ہیں اورایذائیں دے دے کر ان کو مجبورکردیتے ہیں کہ وہ ان کی جماعت سے نکل جائیں۔دوسری طرف وہ دھمکیاں دے کر کہتے ہیں کہ اپنی الگ جماعت قائم نہ کرو۔ اگرتم نے الگ ایک فرقہ بنالیا توتم فرقہ پرست ہوگے۔ تم ایک اقلیت ہو۔ہماری اکثریت ہے اوریوں اپنی اکثریت کے غلبہ اوراقتدار سے مسیحی کلیسیا کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔

الاماں ازروح گاندھی الاماں

الاماں ازگاندھیاں این زماں

مذہبی رواداری کے مبلغ اپنے قول کے خلاف تعصب سے کام لے کر ہم کو جماعت سے خاجر کرکے یہ ثابت کردیتے ہیں۔ کہ ان کے قول اورفعل میں مطابقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گومسیحی مبلغین ایسے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ جن کا جائز ہونا عدالت میں بھی ثابت ہوسکتا ہے توبھی غیرمسیحی تبدیلی مذہب کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ فرقہ وارانہ تناسب کی وجہ سے ہر فرقہ کا سیاسی وقاراس کی تعداد پر منحصر ہوگیا ہے۔ پس یہی مذہبی رواداری کے وکیل اس بات کی برداشت نہیں کرسکتے کہ کوئی شخص اپنے مذہب کوتبدیل کرکے مسیحی ہوکران کے سیاسی اقتدارمیں خلل ڈالے۔ حالانکہ انہی غیرمسیحی وکلائے رواداری کے طرزعمل کی وجہ سے مذہب کی تبدیلی ایک جماعت سے نکل کر دوسری جماعت میں داخل ہوکر ہی ہوسکتی ہے۔ اس کا صحیح علاج یہ نہیں کہ وہ نومریدوں کونت نئی دھمکیاں دیں اور مشنریوں کوملک بدکرنے کی بڑیں ہانکیں۔واجب تویہ تھاکہ مسٹر گاندھی اورکانگریس کی طرح فرقہ وارانہ تناسب جیسے تباہ کن اصول کو سرے سے ردکردیتے پر اُنہوں نے اُس کو قومی مفاد کے خلاف تسلیم کرنے کے باوجود اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کی وجہ سے رد نہ کیا۔ غیرمسیحیوں کوچاہیے کہ وہ اپنا طرز عمل بدلیں۔تعصب اورتنگدلی کوچھوڑ کر فراخدلی اورحقیقی رواداری اختیار کریں اورنومریدوں پر ظلم وستم کرکے ان کو اپنی جماعت سے خاجر کرنے کے عوض ان کومذہبی آزادی دیں تاکہ ان کو ضمیر اورمذہب کی کامل آزادی حاصل ہو اوران کو یہ حق ہو کہ بغیر کسی قسم کی روک ٹوک کے وہ جماعت سے خارج ہوئے بغیر جس مذہب کوچاہیں قبول کرلیں۔اوردوسروں میں آزادانہ اپنے خیالات کی تبلیغ کرسکیں۔ اگر ہمارے غیر مسیحی برادران موجود رویہ کو اختیارنہ کرتے اوراپنے گھر خاندان اوران جماعت سے نکلنے کی ضرورت نہ پڑتی اورنہ مسیحی جماعت کے الگ وجود کی ضرورت پڑتی بلکہ جس طرح لنکا چین وجاپان کے مسیحی منجئی کونین کے حلقہ بگوش ہوکر اپنے آباواجداد اوردیگر رشتہ داروں کے ساتھ ایک ہی جماعت میں رہ کربودوباش کرتے ہیں ۔ ہندوستانی مسیحیوں کو بھی اپنے گھروں کوخیرباد کہنے کے نوبت نہ آتی۔ ہندوستان میں مسیحی جماعت کا وجود ہمارے غیرمسیحی برادران کی تنگ دلی کا نتیجہ ہے۔

ع ہم الزام اُن کودیتے تھے قصوراپنا نکل آیا

ہمارے غیر مسیحی برادران مسیحی نومریدوں کو اپنی ذات برداری جماعت سے خاجر کرنے پر ہی قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ جب ان کو مسیحی جماعت میں قبول کرلیا جاتا ہے تو مسٹر گاندھی کی طرح طعنے دیتے شروع کردیتے ہیں کہ مسیحی مبلغین دنیاوی مال کا لالچ دے کر ان کو مسیحی جماعت میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ غریب ان کے مذہبی تعصبات کی وجہ سے بے خانمان اوربے سروسامان ہوجاتے ہیں۔ اوراگر مسیحی کلیسیا اس حالت میں ان کی مدد نہ کرے تووہ کیا کریں اور کہاں جائیں؟

پر کتُر کر مجھے کہا ہے کہ اس جا سے نکل جا
ایسی بے پر کی اڑاتانہ تھا صیاد کبھی

غالباً یہ الزام اس غرض سے وضع کیا گیا ہے تاکہ مسیحی مبلغین اس الزام سے خوف کھاکر کسی شخص کو جومذہب کی وجہ سے اپنے خاندان اورذات برداری سے خارج کیا جائے مسیحیت میں قبول نہ کریں اوریوں اس چال سے مسیحیت کی اشاعت بند ہوجائے۔

مسٹرگاندھی کویادرکھنا چاہیے کہ کلیسیا کا فرض ہے کہ ایسے بے سروسامان اوربے خانمان شخص کی مدد کرے جواہل ہنود کی تنگدلی اورکم ظرفی کی وجہ سے لاچارہوجاتا ہے۔ کیونکہ سیدنا مسیح نے فرمایا ہے کہ :

" جوبھوکوں کوکھانا کھلاتا ہے ۔ پیاسوں کو پانی پلاتا ہے ۔ پردیسوں کو اپنے گھر میں اُتارتا ہے ۔ ننگوں کو کپڑا پہناتا ہے ۔ بیماروں کی خبرگیری کرتا ہے وہ ان کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرتا ۔ بلکہ خود خداوند مسیح کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے" (متی ۲۵باب)۔

اگریہ کہا جائے کہ مسیحی کلیسیا اچھوت ذات کے لوگوں کو بہتر سلوک کی تحریص وترغیب دے کر ان کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کرتی ہے تو ہم یہ جواب دیں گے کہ مسیحی اُخوت ومساوات کے اصول کل بنی نوع انسان پر حاوی ہیں اوریہ مسیحیت کا امتیازی نشان ہے کہ مسیحیت میں ہر قسم کی امتیازات دُور ہوجاتی ہیں اوربرہمن اورشودایک دوسرے کےساتھ بھائیوں کی طرح رہ کرآپس میں برادری کے رشتہ میں منسلک ہوجاتے ہیں۔ ہم اچھوت اُدھار کے حامی مسٹرگاندھی سے پوچھتے ہیں کہ کیاآپ آریہ سماجیوں کویہ کہ کرمنع کریں گے کہ اگراچھوت آریہ سماج میں داخل ہوجائیں توان سے بہتر سلوک نہ کیا جائے؟ اگرآپ یہ نہیں کہہ سکتے توآپ کس

منطق کی رُو سے مسیحیوں کو اچھوت ذاتوں کے ساتھ مساویانہ اوربرادرانہ سلوک کرنے سے منع کرسکتے ہیں؟

اگرمسٹرگاندھی تواریخ کلیسیا سے واقف ہوتے تو ان پر واضح ہوجاتا ہے کہ مسیحیت کی ترقی اس کی دنیاوی ترقی پر موقوف نہیں ہے۔بلکہ یہ اس کی اندرونی قوت اورروحانی طاقت پر منحصر ہے۔ پہلی تین صدیوں میں مسیحیوں کوہر طرح کی ایذائیں برداشت کرنی پڑیں۔ قیاصرہ روم نے اپنا تمام زورمسیحیت کو تباہ کرنے کی خاطر خرچ کردیا لیکن مسیحیت دن دگنی اوررات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ یہی حال ہر ا یک ملک میں کلیسیا کی ترقی کا ہوا۔ انشا اللہ یہی حال ہندوستان میں ہوگا۔ جس قدر مسٹر گاندھی اوران کے ہم خیال اصحاب مسیحیت کو دبائیں گے اورمسیحی تبلیغ واشاعت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں گے اسی قدرمسیحیت کی ترقی ہوگی کیونکہ شہدا کا خون کلیسیا کا بیج ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است ہرجریدہ عالم دوام ما

مسٹرگاندھی نے اچھوت ذات کے لوگوں کیلئے ایک نیا نام تجویزکیا ہے۔آپ ان کو"ہریجن" کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کے معنی " وشنو کا بیٹا" ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ سوائے مسیحیت کے شمالی ہندوستان کے ہرمذہب نے ان غریبوں کیلئے نئے نام تجویز کر رکھے ہیں۔ اوریوں ذات کے وجود کو برقراررکھا ہے۔ مثلاً جب کوئی چوہڑہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوجاتا ہے تواس کو" مُسلی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اگروہ آریہ دھرم قبول کرلیتا ہے تو شُدھ ہونے کے باوجود وہ " ہندو" نہیں بلکہ" مہاشہ" کہلاتا ہے۔ اوراگروہ شُدھ نہ ہوتو" ہریجن" کہلاتا ہے ۔لیکن مسٹر گاندھی کسی برہمن یاکشتری کو"ہریجن" یا " وشنو کا بیٹا" کہنے کی جرات نہیں کرتے۔ جب کوئی چوہڑہ سکھ مذہب میں داخل ہوجاتا ہے تووہ مذہبی سکھ کہلاتا ہے۔ علی ہذا القیاس ہرمذہب نے اس بچارے کونیا دے رکھا ہے تاکہ ذات کی تمیز برقراررہے۔ لیکن مسیحیت ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں کسی نومرید کوکوئی نیا نام نہیں دیا جاتا۔ اگربرہمن یا سید یا شیخ مسیحی ہوجائے۔ تووہ " مسیحی " کہلاتا ہے۔ اگرچوہڑہ مسیحی ہوجائے تو وہ بھی " مسیحی"

کہلاتا ہے۔ ذات کی تمیز کو سرے سے اڑادیا جاتا ہے۔دیگر مذاہب
کے پیرو نہ صرف نیانام دے کر اس تمیز کو برقرار رکھتے ہیں بلکہ وہ
اپنی لڑکیوں کا بیاہ تک ان نومریدوں سے نہیں کرتے اوریوں اس تمیز کو
مستحکم کردیتے ہیں۔ لیکن مسیحیت کے حلقہ میں یہ روزمرہ کا
مشاہدہ ہے کہ جولوگ اُونچی ذاتوں سے مسیحی ہوتے ہیں ۔ وہ بے
تامل اپنی لڑکیاں اُن قابل نومریدوں کودے دیتے ہیں جواچھوتوں سے
مسیحی ہوتے ہیں۔ پس مسیحیت اپنی تعلیم اورکلیسیا اپنے فعل سے
ہندوستان پر ثابت کررہی ہے کہ ذات پات کی لعنت صرف
مسیحیت کے قبول کرنے سے ہی دورہوسکتی ہے۔ جب یہی لوگ
جوبالفاظ مسٹر گاندھی" گائے بیل سے بدتر تھے اورجن میں روحانی
بھوک نام کو بھی نہیں"مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوگئے اُنہوں نے
یہاں تک ترقی کی کہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق جہاں پندرہ
فیصدی ہندو مرد اورڈیڑھ فی صدی ہندوعورتیں پڑھ لکھ سکتی
ہیں وہاں ان مسیحیوں میں ۳۲ فی صدی مرد اور۱۸ فی صدی عورتیں
لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ کیا یہ ترقی حیرت انگیز نہیں ؟ ہندومت اوراسلام
میں سرے سے یہ اہلیت ہی نہیں کہ وہ ان اچھوت اقوام کی ترقی کا
وسیلہ ہوسکیں۔ مسٹر گاندھی نے پونا پیکٹ سے لے کر تاحال ان
اچھوتوں کے لئے کیا کام کیا؟ اوران کی زیر سرکردگی ان اقوام نے کیا ترقی
کی؟ ہاں مسٹر گاندھی نے ان کی خاطر چند ایک "اُدھار سبھائیں" ضرور
قائم کردی ہیں۔ جن میں چند بے فکرے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں
اورآئے دن ان سبھاؤں کی آمدنی کے صیغہ میں غبن ہوتا رہتا ہے۔
اچھوت اقوام کے ایک لیڈر جگدیش شنکر ودیارتھی کہتے ہیں:

" درحقیقت ہم اچھوت ، شودر نہیں ہیں۔۔۔ دراصل ہم
باشندگان قدیم ہندوجوآریہ حملہ آوروں سے پیشتر براعظم ایشیا کے
حقیقی مالک اورحکمران تھے ۔ آریوں نے غلام بنانے کے بعد نہایت
ناپاک مکروہ ناموں سے نامزد کرکے تاقیامت ہماری اُنیس کروڑ کی
تعداد کو محض برہمن کشتری بنئے کی خدمت گذاری کرکے اسی کو
ہمارا جزو ایمان بنادیا۔۔۔ حیوان کی طرح رات دن بلا معاوضہ کام
کرنا اوراُنہی کے سڑے گلے باسی جھوٹے ٹکڑوں کوکھاکر شکم پروری
کرنا۔ پھٹے پُرانے چیتھڑوں سے تن پوشی کرنا۔ گندی جگہوں میں گھاس
پھونس کی جھونپڑیاں بناکر رہنا۔ گندے جوہڑوں سے جہاں گائے
بھینس وغیرہ پانی پی کر اکثر پاخانہ پیشاب کردیا کرتی ہیں۔ ایسا پلید
پانی پینے پر ہم کو مجبورکیا جاتا ہے۔ تعلیم وہنر ہماری اقوام کے روزِ
اوّل سے قسمت میں نہیں لکھی ۔ ہندومذہب نے ہم کو حیوان بنا

ڈالا۔اس پر طرفہ یہ ہم کو تاحال ہندومذہب میں رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کا اخلاق فرض تویہ ہے کہ ہمارے ساتھ تمام بدسلوکیاں والا وطیرہ چھوڑکر رشتہ ناطہ میں منسلک کردیا جاتا جیسا کہ عیسائی ہوجانے پر کرلیا جاتا ہے۔ ہماری اُنیس کروڑ کی تعداد کو ہندؤ لکھواکر ہمارے تمام حقوق حاصل کرکے برہمن کشتری ۔ بنئیے قوم کی سیاسی مالی ، دماغی ، فلاح اوربہبودی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ منوسمرتی والا سلوک کیا جاتا ہے۔۔۔ ہندوؤں کے مندروں، دیواستھا نوں ،ہندو ہوٹلوں ۔دھرم شالاؤں ۔سرائے کنوؤں ۔ تالابوں ۔ بادلیوں وغیرہ پر سخت ممانعت ہے۔ بلکہ مرجانے پر بھی ہمیں ہریجن مرگھٹوں میں پھینکا جاتا ہے۔۔۔ ہمارے حقوق کو قبضے میں لاکر ہندو اپنی ترقی کررہے ہیں ۔ اورہماری غریب مظلوم جاتیوں کے لئے نہ کوئی سکول نہ اخبارنہ لائبریری نہ تعلیم وتربیت کاانتظام ہے۔ (احسان لاہور۲۶ فروری ۱۹۴۱ء)۔

دل ہی نہ رہا اُمید کس کی
جڑکٹ گئی نخل آروزکی

مسیحیت نے ان کو بعرِ مذلت سے نکالا ہے۔ مسیحیت کی طفیل ان کو سُدھ بُدھ آگئی ہے۔ ہندومت نے ہزاروں سال سے اوراسلام نے صدیوں سے ان سے حیوانوں کا ساسلوک کرکے ان کو پائمال کر رکھا تھا۔ مسیحیت نے پچاس سال کے اند اندران کو تیرہ وتاریک زنداں سے نکال کر ان کے جسم دماغ اورروح کی خبرگیری کی اوروہ اب اس قابل ہوگئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھ کر اپنی اقتصادی اورسیاسی ترقی کے خواہاں ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا خوب کہا ہے:

" مستقبل زمانہ کی اشد ضرورت ہے یہ تمدنی اوراقتصادی حالات کی بنیاد عدنی اورانصاف کے اصولوں پر قائم ہو۔ اوراگرہندو مت یا اسلام یہ کام نہیں کرسکتے۔ توان کا کوئی مستقبل نہیں ہے"۔

ہندوستان کی تاریخ نے یہ فیصلہ کردیاہے کہ ہندومت اوراسلام اپنے جمود تعطل کی وجہ سے عدل اورانصاف کے اصولوں پر کاربند نہیں رہے۔ لہذا بالفاظ پنڈت جی" ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے" ہندوستان کا مستقبل صرف مسیحیت کے ہاتھوں میں ہے جس سے قوم ہند کی ترقی کی اُمید ہوسکتی ہے، ورنہ

یونہی گررتا رہا غالب تواے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کو ویراں ہوگئیں

۲۱

گاندھی جی کے مذکورہ بالا بیان کا ایک ایک لفظ مسیحی کلیسیا کے لئے خطرہ کی سرخ جھنڈی کا کام دیتا ہے۔ ہم کو اب پتہ چل گیا ہے کہ مذہبی آزادی اورمسیحیت کی اشاعت وتبلیغ کے بنیادی حقوق معرضِ خطر میں ہیں اوروہ گاندھی جی اوران کے مقلدوں کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ گاندھی جی کیوں تبدیلی مذہب پر اس قدرغوغا آرائی کرتے ہیں ۔ ان کو اوردیگر قوم پرستوں کو اس امر کی طرف سے بے نیازہونا چاہیے کہ کون کس مذہب کا پیرو ہے۔ تاوقتیکہ وہ ملک سے غداری نہ کریں۔ لیکن قوم پرستوں کی طرف سے تبدیلی مذہب پر جو نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہےکہ یہ اصحاب خود قوم کے دلدادہ نہیں بلکہ فرقہ وارانہ ذہنیت رکھتے ہیں اوران کی اصلی غایت ہے کہ وہ ہندوؤں کی اکثریت کو قائم رکھیں تاکہ وہ ہندوستان پر غالب رہیں۔ اس پہلو سے جب مسٹر گاندھی اوردیگر ہندوؤ لیڈروں کے خیالات پر اوراُن کی روش پر روشنی پڑتی ہے توہم سمجھ سکتے ہیں کہ جب وہ مسیحیوں سے مخاطب ہوتے ہیں تووہ مذہب اور سیاسیات کو جُدا نہیں کرتے اورایک ہندو کی حیثیت سے بولتے ہیں اورجب برطانوی سلطنت سے مخاطب ہوتے ہیں توقوم پرست ہوکر کہتے ہیں کہ مذہب اورسیاسیات دوجداگانہ باتیں ہیں۔ لیکن ان کا اصل مُدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہندوؤں کا غلبہ قائم رہے۔

۲۲

اس بیان میں ایک اور امر قابلِ غور یہ ہے کہ گاندھی جی مسیحی مبلغین کو قید کی دھمکی دیتے ہیں جومجذوب کی بڑسے زیادہ وقت نہیں رکھتی۔ کیا یہ اُن کی آہمسہ کی تعلیم کا عملی پہلو ہے؟ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ برطانوی گورنمنٹ کے خلاف آپ کے ہاتھوں میں آہمسہ سے زیادہ زبردست حربہ نہیں ہے لہذا وہ آہمسہ پر زوردیتے ہیں لیکن اپنے ہم وطنوں کے خلاف وہ تشدد استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کو آزادی مل جائیگی توآپ آہمسہ اورستیاہ گراہ کے اصولوں کو الوداع کہہ دیں گے۔ اورنرمی اورمحبت کی بجائے ہندوستانی مسیحیوں کو قید اورسختی کی دلیل سے سمجھایا جائیگا۔ لیکن ان کو خود اپنے تجربہ سے جاننا چاہیے کہ قید اورتشدد اُس شخص کے لئے بے معنی چیزیں ہیں جوپہاڑی وعظ کے اعلیٰ ترین اصولوں کے

ہتھیاروں سے مقابلہ کرتا ہے۔ ان کو یہ جان لینا چاہیے کہ شہیدوں کا خون کلیسیا کا بیج ہے اورمسیحی کلیسیا کو پودا اسی خون سے پرورش پاتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ گاندھی جی قیدر وتشدد کی دھمکیاں اس واسطے دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مسیحیت ہندودھرم پر اورہندوستان پر غالب ہوکر رہیگی۔ کیونکہ کوئی شخص کسی بے جان اورنیم مُردہ چیز سے جوخود ہی دم توڑی رہی ہوخائف وہراساں ہوکر دھمکیاں نہیں دیتا۔ مہاتما جی جانتے ہیں کہ اگرچہ مسیحیت اس ملک میں کمزورنظر آتی ہے۔ لیکن بے جان اوربے حس نہیں ہے۔ اس میں مسیح اپنا دم پھونك کر زندہ کرسکتا ہے۔ اورکریگا اورمسیح ہندوستان کا واحد تاجداراورحکمران ہوکر رہیگا۔

ہم حیران ہیں کہ ہر شراب کش کا رخانہ کو شراب کے اشتہارات دینے کا حق حاصل ہے ۔ حالانکہ شراب خانہ خراب ہندوستانی قوم کے حق میں ہیں۔سمِ قاتل کا کام دیتی ہے۔ ہر تماشہ گاہ اورسینما والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ محزبِ اخلاق تماشوں کے اشتہارات آزاد نہ دیں اوریوں قوم کے اخلاق کو تباہ کریں۔ لیکن مسیحی کلیسیا کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ انجیل کا پرچار کرے تاکہ ہندوستان میں اُخوت ومساوات کے اصول قائم ہوں اورخدا کی ابوت اورانسانی اُخوت ومساوات کے اُصول ہندوستان کی بکھری قوم کا شیرازہ بندی کریں۔

آپ ہی اپنے ذرا طرزِعمل کو دیکھیں
ہم جوکچھ عرض کرینگے توشکایت ہوگی

اگرمسیحیوں کو اشاعت وتبلیغ سے قانوناً روکا گیا تو یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنے خداوند اورمنجئی کے حکم کی اطاعت کرنا اورلوگوں کو نجات کی خوشخبری سننا اپنافرض اولین سمجھ کر پر اُمن طریقوں سے ایسے ناجائز قانون کی خلاف ورزی کریں گے ۔ ستیا گارہ کا ہتھیار مسٹر گاندھی ، ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے نیا ہے ۔ لیکن مسیحیوں کے لئے اورکلیسیا کیلئے وہ دوہزارسال سے آزمایا ہوا ہتھیار ہے۔خداوند مسیح نے سب سے پہلے اس ہتھیار کو استعمال کیا۔ جب آپ نے اپنے حواری پطرس کو فرمایا:

" اپنی تلوارکو میان میں کر۔ جوتلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار سے ہلاك کر دئیے جائیں گے ۔ کیا تونہیں جانتا کہ میں اپنے باپ سے منت

کرسکتاہوں اور وہ فرشتوں کی بہتر ہزار سے زیادہ فوج ابھی موجود کردیگا"۔

منجئی عالمین نے ترکی بہ ترکی جواب دئیے بغیر صلیب کی راہ اختیارکی۔ یہی حربہ خداوند کے رسول مقدس پطرس اوررسولوں نے استعمال کیا۔ جب آپ کوعدالت میں سردارکاہن نے کہا:

"ہم نے تم کوسخت تاکید کی تھی کہ یسوع کے نام کی تعلیم نہ دینا۔ مگرتم نے تمام یروشلیم میں یہ تعلیم پھیلادی ہے،

اس پر سردارکاہن کوجواب دیا گیاکہ:

"آدمیوں کے حکم کی نسبت خدا کاحکم ماننا زیادہ فرض ہے۔ خدا نے یسوع کو مالک اورمنجئی ٹھہرایا تاکہ لوگوں کو توبہ کی توفیق اورگناہوں کی معافی بخشے اورہم ان باتوں کے گواہ ہیں"۔

اس پر سردارکاہنوں نے ان کو پٹوایا، لیکن وہ ہر روزاس بات کی خوشخبری دینے سے کہ یسوع ہی مسیح ہے باز نہ آئے"(اعمال ۵باب) ہندوستانی مسیحی انجیل جلیل کے دستورِحیات کو تسلیم کرکے اپنے منجئی کا پیغام تمام خلق اللہ کو پہنچانے سے کبھی بازنہیں رہ سکتے۔کیونکہ یہ ایک ایسی بشارت کا پیغام ہے جوہر زمانہ اورہر ملک کے لئے خوشی کی خبر ہے۔ بالخصوص ہمارے وطن ہندوستان کواس کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہمارے ملک کی زندگی کی کایاپلٹ جائے۔اورہمارے ملک وقوم کی حالت میں انقلاب برپا ہوجائے اوروہ چاہِ ذلت سے نکل کر روحانیت کے اوج پر پہنچ جاؤ مرحوم لارڈ مارلے ایک ملحد شخص تھا۔ لیکن اس نے کہاکہ:

"اگرمیں فی الحقیقت اس بات کا قائل ہوتاکہ یسوع مسیح نے میری نجات کی خاطر اپنی جان دی ہے تومیری زبان کبھی کسی دوسری بات کا تذکرہ ہی نہیں کرتی اورمیرا قلم کسی دوسرے مضمون پر کبھی ایک سطربھی نہ لکھتا"۔

جب ایک ملحد کا یہ حال ہے توایک مسیحی جوالہٰی محبت اورغیرت کی آگ سے جل رہا ہواپنے کرڑوں ہموطنوں کوجوبغیرمسیح کی نجات اوربائبل کے علم کے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ کس طرح سردمہری سے دیکھ سکتا ہے؟

خسرواورعشق بازی کم زہندوزن مباش
کاں برائے مردہ سوزدزندہ جان خویش را

جرمن فلاسفرٹروٹیش نے کیا خوب کہا ہے کہ:

"اگر ایمان میں تبلیغ واشاعت یاتوسیع کی جرات نہیں تووہ " ایمان" کہلانے کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ ایمان کے اندر ایک ایسا

جبرپاایا جاتاہے جوایماندارکواس بات پر مجبورکرتا ہے۔ کہ وہ اپنے ایمان کی خصوصیات دوسروں تک پہنچائے۔اگرہم رواداری کی حد کو قائم نہیں کرتے تورواداری کا صحیح مفہوم نہیں جانتے اورالحاد کے کنارے جاپہنچتے ہیں۔۔۔۔ سچ پوچھو تورواداری موجودہ زمانہ کی بیماری ہے اورایمان کی کمزوری اورلاچاری کا دوسرانام ہے[15]

ہندوستان کی کلیسیا ہرگز اس قسم کی رواداری کواپنا دستور العمل نہیں بناسکتی۔ اُس کا خداوند زندہ غالب اورفاتح ہے۔ لہذا وہ اُس نجات بخش پیغام ہرذی رُوح کوپہنچانا اپنا فرض اولین سمجھتی ہے اوراس کا ہرفردروزِآخرتک اس فرض کوخدا کے فضل سے ادا کرنا موجب سعادتِ دارین خیال کرتا رہے گا۔

[15] Troeltsch, Quoted by Cave p.31

The writer wishes to acknowledge his indebtedness to the following authors, books and periodicals in the preparation of this work:

1. Andrews, C.F. Mahatma Gandhi's Ideas.
2. Badley Bishop, the Solitary Thorne.
3. Bhagwat Gita, Tr. Mrs. Besant.
4. Cash, Missionary Church.
5. Cave, Hinduism and Christianity.
6. Das Gupta, History of Indian Philosophy.
7. Edward's India's Challenge to Christian Missions.
8. Frazer, Sir J.G.The Golden Bough.
9. The Guardian, Madras.
10. Gandhi, M.K.Story of my Experiments with Truth.
11. The Harijan,ed. By M.K.Ghandhi.
12. Hukely, J.S.Essays of Biologist.
13. The Indian Social Reformer, Bombay.
14. Iqbal, Sir Muhammad.
15. Jawaharlal Nehru, Autobiography.
16. Kraemer, Christian Message in a Non-Christian World.
17. Lecky, History of European Morals.
18. Mirror of Indian Philosophy.
19. Mahatma Gandhi by Gray and Parekh.
20. Mozamdar, Pramahama Rama Krishan.
21. Morely, On Compromise.
22. Mufti Ghulam Rasul's Version of Bhagwat Gita.
23. Macnicol Nicole.
24. Otto Idea of the Holy.
25. Paton, William.
26. Polak Mr. Gandhi the Man.
27. The Quran.
28. Radha Krishnan Sir. S.Philosphy of Rabindra Nath Tagore.
29. Radha Krishnan Sir's. Hindu View of Life.
30. Radha Krishnan Sir's. Idealist View of Life.
31. Roy. Raja Ram Mohan Works.
32. Rethinking Missions, Appraisal Commission's Report.
33. Satyarath Parkash,Tr. By Radha Kishen Mehta.
34. Sorely Moral Values and the Idea of God.

35. The Student World.
36. The Student Outlook.
37. Similarity of All Religions.
38. Tagore, Sir Rabindranath, Letters to a Friend.
39. Tagore, Sir Rabindarnath, Sadhan.
40. Tagore, Sir Rabindarantth, Personality.
41. Taylor, the Faith of a Moralist.
42. Temple, William-Archbishop of York.
43. Vivekanand Swami Works.
44. World’s Parliament of Religions, 1893.
45. World Mission of Christianity.

BARAKAT ULLAH.

C.M.S
PATTOKI, DIST, LAHORE
FEB.28TH 1941